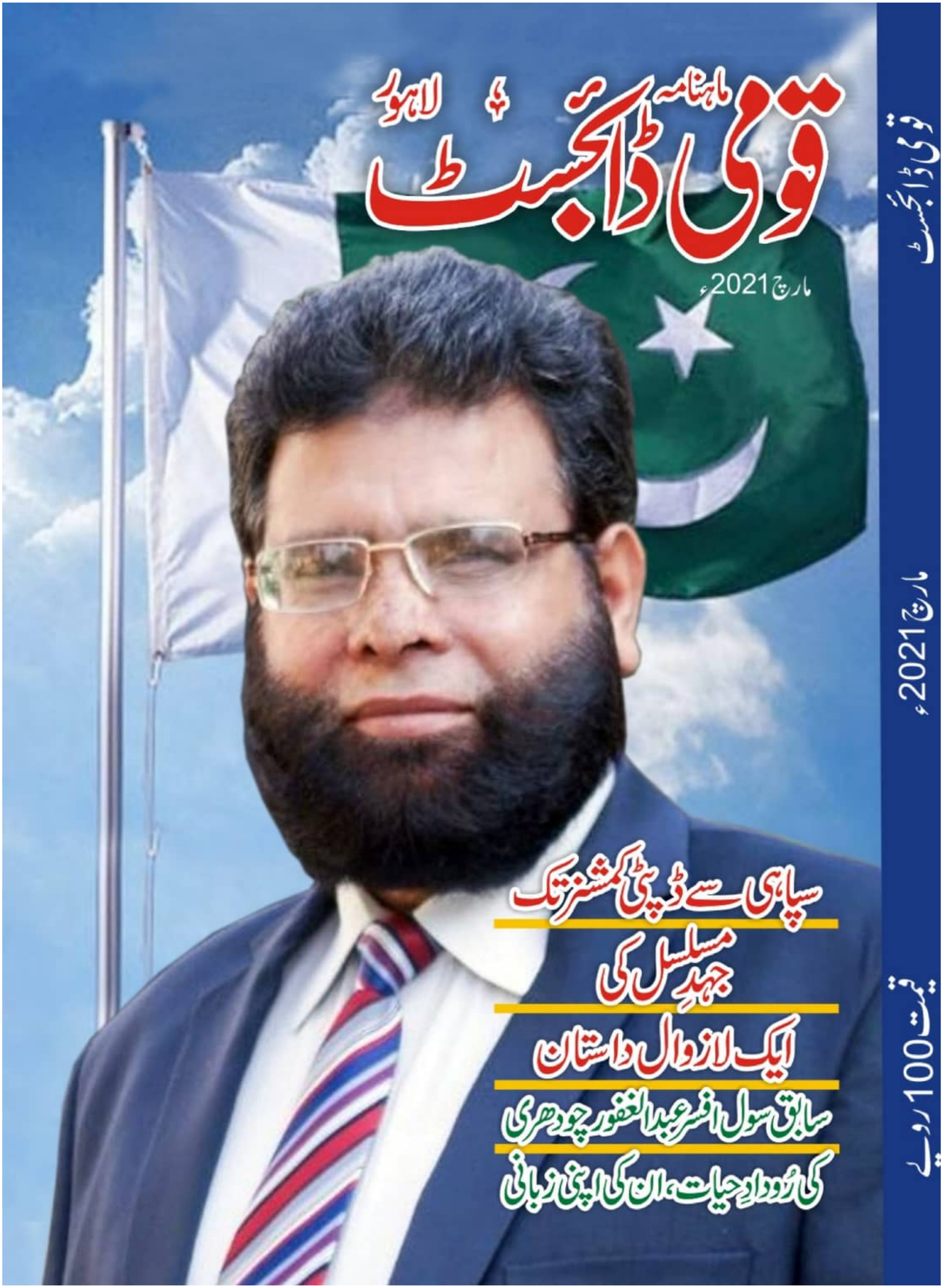

Scanned with CamScanner

روزنامہ پاکستان

قوم کے ہر فرد کی آواز

ماہنامہ لاہور

قومی ڈائجسٹ

مارچ 2021 ◉ جلد 43 ◉ شمارہ 3

چیف ایڈیٹر: مجیب الرحمٰن شامی

ایڈیٹر: عثمان شامی

مینجنگ ایڈیٹر: علی شامی

سینئر ایڈیٹر: خالد ہمایوں

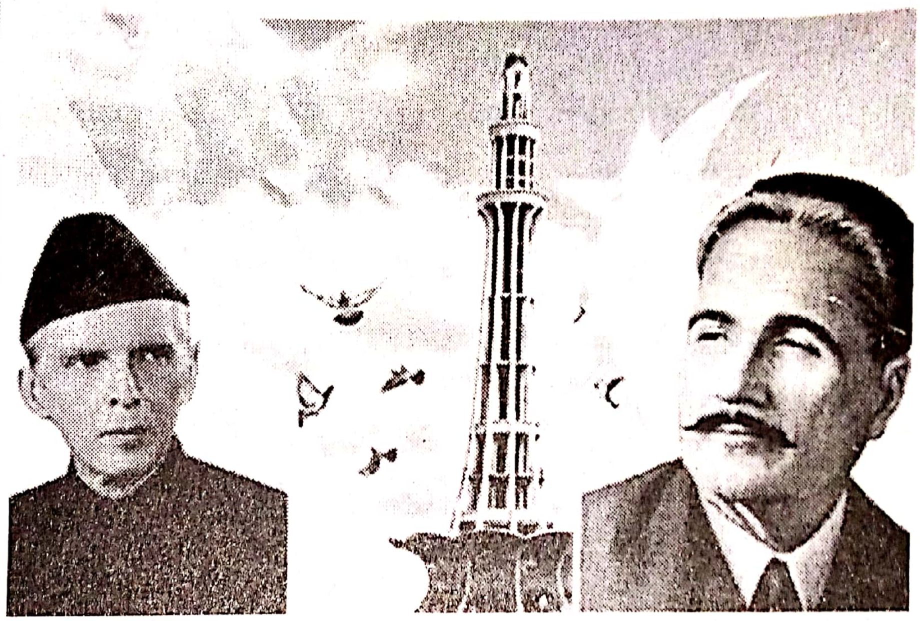

23 مارچ 1940ء

یوم قراردادِ پاکستان

قیمت: پاکستان: 100 روپے۔ سالانہ چندہ: بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 1440 روپے، بذریعہ عام ڈاک 1000 روپے ۔ متحدہ عرب امارات: 11 درہم ۔ سعودی عرب: 11 سعودی ریال
بیرون ملک بدل اشتراک: سعودی عرب، یو اے ای، بحرین، قطر، تھائی لینڈ، چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور، مالدیپ، ڈنمارک، ناروے، فرانس، سویڈن، ہالینڈ، بلجیم، یونان، جرمنی، برطانیہ 4000 روپے انڈونیشیا، ملائیشیا، نائیجریا، جنوبی افریقہ، بھارت، لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش 4000 روپے، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ 4500 روپے

خط و کتابت کا پتہ: دفتر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ 41 جیل روڈ لاہور، فون: 65-042-35404061
فیکس: 67-042-35404066

Email
qaumidigestpak@gmail.com

مجیب الرحمٰن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس سے چھپوا کر 41 جیل روڈ لاہور سے شائع کیا

Scanned with CamScanner

قلمبندی: عبدالستار اعوان

عبدالغفور چودھری

عبدالغفور چودھری نے قصور کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے سخت محنت کر کے نمایاں مقام حاصل کیا۔ دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا کہ انہیں والد صاحب کے سیاسی حریفوں نے قتل کے ایک جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی۔ عبدالغفور چودھری ایک ٹھٹھرتی صبح گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے اور چھپتے چھپاتے قصور پہنچے اور پھر لاہور میں اپنے ماموں زاد بھائی فرزند علی جو کہ فوج میں ملازم تھے کے پاس آ کر پناہ لی۔ فرزند علی نے انہیں فوج میں سپاہی بھرتی کروا دیا۔ جس وقت روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں عبدالغفور چودھری پاک افغان سرحد پر اپنے دو ساتھیوں سمیت سب سے بلند پہاڑی چوٹی پر قائم ''ابزرویشن پوسٹ'' پر تعینات تھے۔ چودھری صاحب نے روسی جارحیت کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ موت کو بہت نزدیک سے دیکھا جب روسی گن شپ ہیلی کاپٹر ان کی پوسٹ کے عین اوپر آ گیا اور روسی فوج کے آرٹلری دستے نے وہاں شدید گولہ باری شروع کر دی۔ چودھری صاحب نے عسکری ملازمت کے دوران بھی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا اور ''آرمڈ فورسز بورڈ فار ایجوکیشن'' میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد پاک فوج میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر کے لئے اپلائی کیا اور سپاہی سے براہ راست نائب صوبیدار (ایجوکیشن) کے طور پر سلیکٹ ہو گئے۔ وہ اپنے پورے بیج میں سب سے کم عمر نائب صوبیدار تھے۔ اس کے بعد بی ایڈ، ایم اے اسلامیات اور ایم اے انگلش کیا۔ 1994ء میں پی سی ایس مقابلے کا امتحان دیا لیکن میرٹ اچھا نہ ہونے کے سبب انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے بجائے ''اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز'' تعینات کر دیا گیا۔ 1996ء میں دوبارہ پی سی ایس کا امتحان دیا اور حکومت پنجاب نے انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ فرسٹ کلاس) تعینات کر دیا۔ چودھری صاحب کو ''پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' لاہور میں بطور جوڈیشل آفیسر اور لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن میں اہم عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنجاب کے مختلف اضلاع اور ڈویژنز میں بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول)، سپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، ڈائریکٹر اینٹی کرپشن، ڈپٹی سیکرٹری، ایڈیشنل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے طور پر کام کیا اور 2019ء میں بطور ڈپٹی کمشنر سبکدوش ہوئے۔ چودھری صاحب نے افسر شاہی، سیاست اور مختلف سماجی رویوں کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا۔ میں چودھری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ''قومی ڈائجسٹ'' کے لئے اپنی دلچسپ یادداشتیں محفوظ کرنے کے لئے بہت تعاون کیا۔ ان یادداشتوں میں کئی گوشے تو خاصے چشم کشا ہیں۔ امید ہے قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرا تعلق ارائیں فیملی سے ہے۔ میرے آباؤ اجداد 1947ء میں ایک گاؤں جودھ سنگھ والا، تھانہ کھیم کرن، تحصیل قصور ضلع لاہور، جواب بھارت میں ہے سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور چاہ ہری والا، موضع کھنگرانوالہ تھانہ کھڈیاں خاص، تحصیل قصور ضلع لاہور (اب ضلع قصور) میں آ کر آباد ہو گئے۔ میرے والد صاحب کا نام مہر محمد اسماعیل اور والدہ کا نام زینب بی بی تھا۔ والد صاحب کی تعلیم چار جماعت (اس وقت کی پرائمری) تھی اور والدہ صاحبہ صرف قرآن پاک پڑھی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنے والدین کو صوم وصلوٰۃ کا پابند ہی دیکھا۔ والد صاحب پیشے کے لحاظ سے کاشتکار تھے۔ بہت محنتی تھے۔ ایک بار بلدیاتی الیکشن بھی لڑا۔ والدہ صاحبہ ان پڑھ ہونے کے باوجود بڑی زیرک، سمجھدار اور دانا خاتون تھیں۔ گاؤں کی زیادہ تر خواتین ان کے پاس مشورے لینے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ وہ تہجد گذار بھی تھیں۔ ہم تمام بہن بھائی جب شام کے وقت چولھے کے اردگرد بیٹھ کر اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہو کھانا کھایا کرتے تھے تو ہماری ماں روزانہ کی بنیاد پر ہمیں کوئی نہ کوئی نصیحت کیا کرتی تھیں۔ وہ ہمیں دیانتداری، ایمانداری، عدل وانصاف، محبت، رواداری، خلوص، نیک نیتی اور محنت جیسی اعلیٰ صفات کو اپنانے کا درس دیا کرتی تھیں۔ ہم اپنی والدہ صاحبہ کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم نے جب بھی کوئی کام اپنی ماں کے مشورے کے بغیر یا ان کی رائے کے برعکس کیا، ہمیں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔

میری تعلیمی اسناد کے مطابق تاریخ پیدائش 14 فروری 1959ء ہے۔ اس وقت ماسٹر صاحب بچے کا قد دیکھ کر داخلہ رجسٹر پر تاریخ پیدائش لکھا کرتے تھے۔ میں تقریباً چھ برس کا ہوا تو مجھے گورنمنٹ پرائمری سکول کھنگرانوالہ میں جماعت اول میں داخل کروا دیا گیا۔ اس وقت نہ تو پرائیویٹ ادارے تھے اور نہ پی جی، نرسری اور پریپ کلاس کے ڈرامے ہوتے تھے۔ اول سے پانچویں جماعت تک صرف حساب اور اردو کے مضامین پڑھائے جاتے۔ کاپی عام طور پر شاید چوتھی جماعت سے استعمال میں آتی تھی۔ اس سے پہلی کلاسوں میں سلیٹ اور تختی کا استعمال ہوتا۔ سلیٹ پر سلیٹی یا چاک سے لکھا جاتا تھا اور تختی کو لکھائی کے لئے تیار کرنے کے لئے اس پر چکنی مٹی، جسے ہم گاچنی کہتے تھے کی لیپ کر کے اس کو دھوپ میں سکھایا جاتا تھا۔ بعد میں سیاہی کا استعمال کرتے ہوئے سرکنڈے کی بنی ہوئی قلم کے ساتھ اس پر لکھائی کی جاتی تھی۔ ہم تختیوں کو دھونے والا کام آدھی چھٹی کے دوران، سکول کے سامنے موجود چھپڑ پر جا کر انجام دیا کرتے۔ اسی دوران ہم گھر سے لایا ہوا لنچ بھی کھایا کرتے تھے۔ ہمارے لنچ میں نہ تو کوئی شامی کباب ہوتا تھا۔ نہ ہی ڈبل روٹی، نہ آلو کے چپس اور نہ انڈے سے بنی ہوئی

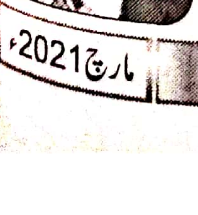

ہم نے جب بھی کوئی کام اپنی ماں کے مشورے
کے بغیر یا ان کی رائے کے برعکس کیا
ہمیں نقصان ہی اٹھانا پڑا

ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت سے ہماری تعلیم میں زوال کا آغاز ہوا اور اس زوال کا مداوا ابھی تک کوئی حکومت نہیں کرسکی

مختلف ڈشیں، وہ پونے (رومال) میں باندھے گئے دیسی گھی سے بنے ہوئے پراٹھے اور گھر کے بنے ہوئے اچار پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہم نلکے کے پاس بیٹھ کر یا بعض اوقات سکول کے پاس ہی موجود مسجد میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور جب پانی کی طلب ہوتی تھی تو نلکے یا ٹونٹی کو منہ لگا کر تازہ پانی پی لیا کرتے۔ آدھی چھٹی کے بعد ہم تختیاں لکھا کرتے۔ آخری پیریڈ میں ہمیں سکول کی دیواروں کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تھا اور ہم میں سے ایک ایسا طالبعلم جس کو پہاڑے آتے ہوں اسے ہمارے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہ اونچی آواز سے پہاڑے پڑھتا تھا اور ہم سب اس کے پیچھے پیچھے اونچی آواز سے پہاڑوں کو دہرایا کرتے تھے۔ سکول میں صرف ایک تختہ سیاہ ہوتا تھا جس پر چاک سے لکھا جاتا تھا۔ عام طور پر باری باری ایک بچے کو گیلا کپڑا دے کر تختہ سیاہ کے پاس کھڑا کر دیا جاتا تھا تاکہ ماسٹر صاحب جب اشارہ کریں تو تختہ سیاہ پر لکھی گئی تمام تحریر کو گیلے کپڑے سے مٹا دے۔

میرا سکول چاہ ہری والا سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں بستہ اپنے کندھے پر ڈال کر اپنے گھر سے پیدل سکول جاتا۔ بستہ عام کپڑے کا بنا ہوا ہوتا جس میں اکثر سیاہی والی دوات میں سے سیاہی لیک ہو جاتی تھی۔ اس طرح بستے پر عام طور پر کالے دھبے پڑے ہوتے تھے۔ ہم بعض اوقات سیاہی کی دوات اپنی وردی کی سامنے والی جیب میں بھی ڈال لیتے تھے۔ وہ بعض اوقات لیک ہو کر ہماری قمیض کی جیب کو بھی دھبے دار کر دیتی تھی۔

اس سکول میں ماسٹر بشیر شاہ صاحب اکلوتے استاد تھے جو اکیلے ہی تمام جماعتوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ قریبی گاؤں محمود پورہ کے رہنے والے تھے۔ سفید لباس پہنتے تھے۔ گورے چٹے سید تھے۔ نہایت ایماندار اور فرض شناس استاد تھے۔ ان کی محنت کی وجہ سے ہر سال ہمارے سکول کے کئی بچے وظیفے کے لیے امتحان دیتے تھے اور کامیاب بھی ہوتے تھے۔ ماسٹر بشیر شاہ صاحب پر لوگ بہت اعتماد کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے جھگڑوں کے فیصلے بطور ثالث بھی کیا کرتے تھے۔ میں پانچویں جماعت کے امتحان میں جماعت میں اول آیا اور چھٹی جماعت میں داخلے کا مرحلہ آیا۔ اس اثنا میں ہم کوٹ ارائیاں والا میں نئے مکان بنا کر منتقل ہو گئے تھے۔ ہائی سکول میرے گھر سے تقریباً چھ کلومیٹر دور تھا سڑک موجود نہ تھی۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی تصور نہ تھا۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ بائیسکل بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ میرے والدین سوچ میں پڑ گئے کہ بچہ اتنی دور روزانہ کیسے جایا کرے گا۔ ایک موقع پر یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ مجھے ہائی سکول میں داخلہ نہ دلوایا جائے بلکہ کھیتی باڑی پر لگا دیا جائے۔ لیکن میں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے پر اصرار کیا اور ماں جی کو بھی اس حوالے سے ساتھ ملا لیا۔ میں نے کہا کہ میں پیدل چلا جایا کروں گا۔ بالآخر بڑوں نے فیصلہ دیا کہ مجھے ہائی سکول میں

Scanned with CamScanner

داخل کروادیا جائے، چنانچہ مجھے میرے دو ماموں زاد بھائیوں حافظ محمد عیسیٰ اور حافظ محمد موسیٰ کے سپرد کر دیا گیا جو مجھ سے ایک کلاس سینئر تھے۔ میری ماں، باپ یا بڑے بھائیوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ خود مجھے ہائی سکول میں داخل کروانے جائیں۔ انہوں نے میری پڑھائی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔ میں عام طور پر کلاس میں پہلی یا دوسری پوزیشن لیتا تھا لیکن میرے گھر والوں نے کبھی اس پر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انہیں صرف اس بات سے غرض ہوتی تھی کہ میں ہر سال پاس ہو کر اگلی کلاس میں چلا جاؤں۔

یہ اپریل 1970ء کی بات ہے کہ مذکورہ حافظ برادران مجھے اپنے ساتھ گورنمنٹ ہائی سکول کھڈیاں خاص، تحصیل وضلع قصور لے گئے۔ یہ سکول اس سے پہلے ڈی سی (ڈپٹی کمشنر) ہائی سکول ہوتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت کے وزیراعظم پاکستان نے باقی تعلیمی اداروں اور صنعتوں کے ساتھ اس ادارے کو بھی قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس سے ہماری تعلیم میں زوال کا آغاز ہوا اور اس زوال کا مداوا ابھی تک کوئی حکومت نہیں کر سکی۔ خیر، مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملوایا گیا۔ ویسے تو اس سکول میں بغیر داخلہ ٹیسٹ لئے کسی بچے کو داخلہ نہیں ملتا تھا لیکن میں چونکہ ماسٹر بشیر احمد شاہ کا شاگرد تھا اس لئے مجھے اس سکول میں بغیر داخلہ ٹیسٹ کے داخلہ مل گیا۔ اس وقت انگریزی کی پڑھائی چھٹی جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ یعنی ہمیں اے بی سی چھٹی جماعت میں سکھائی گئی۔ میں یہاں پر بھائی نذیر احمد ولد حاجی فضل دین، جو ہمارے پڑوسی تھے اور مجھ سے کافی سینئر تھے کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے اس وقت مجھے بڑی اے بی سی سکھا دی جب میں پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ جس کا مجھے سارے تعلیمی کیریئر میں فائدہ ہوا۔ میرا داخلہ گورنمنٹ ہائی سکول کھڈیاں خاص میں جماعت ششم میں ہو گیا۔ داخلے کے ساتھ ہی آزمائشیں اور مشکلات شروع ہو گئیں۔ روزانہ کی بنیاد پر بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے نامساعد حالات میں میں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور وہ منزل پانے میں کامیاب ہو گیا جس کا خواب ماں جی نے دیکھا تھا۔ ہمارے چھٹی کلاس کے انچارج عبدالرحمٰن صاحب تھے۔ بڑے محنتی اور ماہر استاد تھے۔ چھڑی ہر وقت ان کے پاس ہوتی تھی۔ کوئی طالب علم پڑھائی میں ذرا سی کوتاہی کرتا تو اس کی خاطر مدارت چھڑی سے ہوتی۔ ایک دو دفعہ میرا بھی ان کی اس مہربان چھڑی سے پالا پڑا تو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ خاص کر ٹھٹھرتی سردی کے موسم میں جب وہ ہاتھوں پر ڈنڈے مارتے تھے تو ہم ہاتھوں کو اپنی بغلوں میں داب لیتے تھے تاکہ تکلیف کی شدت کم ہو۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ایک دفعہ ڈنڈا کھانے کے بعد طالب علم کی طبیعت کافی دنوں تک درست رہتی تھی۔ اگرچہ میرے گھر میں میری تعلیم پر

ایک صبح میں سعید احمد کے گھر گیا تو وہاں صفِ ماتم بچھی تھی، معلوم ہوا کہ سعید احمد کو کسی نے قتل کر کے کھڈیاں خاص کے پاس سے گزرنے والی نہر میں پھینک دیا تھا، اس کی نعش نہر سے برآمد ہوئی ہے

Scanned with CamScanner

پھر بھائی فرزند علی نے فوج کی نوکری کے فضائل ومناقب اس انداز سے بیان کیے کہ ایسے لگ رہا تھا کہ پوری دنیا میں فوج کی نوکری سے بہتر کوئی ملازمت نہیں

توجہ دینے والا کوئی شخص موجود نہ تھا لیکن ہمارے اساتذہ کرام والدین کی یہ کمی بھی پوری کر دیتے تھے۔ 1971ء میں میں ساتویں جماعت میں تھا۔

خیر اسی طرح خراماں خراماں تعلیمی سفر جاری رہا ہے اور میری ترقی نویں جماعت میں ہوگئی۔ اس وقت میٹرک میں صرف دو ہی گروپ ہوتے تھے سائنس گروپ اور آرٹس گروپ۔ سائنس گروپ میں لازمی مضامین کے علاوہ طبیعات، کیمیا، ریاضی اور فزیالوجی اینڈ ہائی جین (جسے آج کل بیالوجی کہتے ہیں) کے مضامین پڑھائے جاتے۔ اس وقت تک کمپیوٹر کا مضمون متعارف نہیں ہوا تھا۔ پڑھنے والے بچے سائنس گروپ کے مضامین پڑھتے تھے اور جو بچے تعلیمی لحاظ سے قدرے کمزور ہوتے وہ آرٹس گروپ کے مضامین پڑھتے۔ اس وقت نویں جماعت کا امتحان بورڈ کا نہیں ہوتا تھا۔ نویں اور دسویں کا اکٹھا امتحان ہوتا، بچوں کو پڑھائے گئے اسباق دو سال تک یاد رکھنے پڑتے تھے۔ اس لیے ہم نے جو کچھ پینتالیس سال پہلے پڑھا اس میں سے بہت کچھ اب بھی یاد ہے۔ نویں اور دسویں جماعت میں ہمیں مومن صاحب، سر محمد صدیق انجم صاحب، سر محمد سلیم صاحب، سر ظفر اقبال صاحب وغیرہ نے پڑھایا۔ کیا استاد تھے اور کیا شاگرد! وہ صرف استاد نہیں تھے بلکہ صحیح معنوں میں روحانی ماں باپ، ہمارے رہبر و راہنما، ہمارے مصلح، ہمارے ہمدرد اور غمخوار تھے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد میرے گھر میں پھر سے بحث چھڑی کہ اسے کالج بھیجا جائے یا نہیں۔ گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج قصور میرے گھر سے 29 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ کالج جانے کے لئے پہلے تو مجھے چھ کلومیٹر بائیسکل چلا کر کھڈیاں خاص تک جانا تھا۔ پھر وہاں سے بس میں سوار ہو کر قصور جانا تھا اور 23 کلومیٹر کا سفر بذریعہ بس طے کرنا تھا۔ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گھر والوں کو آفر بھی دی کہ میں قصور میں کالج کے ہاسٹل میں رہ لوں گا۔ ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچہ خود چلا لوں گا۔ ماں جی نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا لیکن جب ہاسٹل میں رہنے کی بات آئی تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ میرا خواب تھا کہ میں یا تو ڈاکٹر بنوں یا پروفیسر۔ لیکن میں تو بے بس تھا، مجبور تھا، میرے مستقبل کے فیصلے کرنے کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ مجھے ہمارے گاؤں کے ایک دندان ساز جنہوں نے کھڈیاں خاص میں اپنا کلینک بنایا ہوا تھا کی شاگردی میں دے دیا جائے۔ چنانچہ مجھے ان کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ تقریباً ایک سال گزر گیا۔ اس عرصہ میں استاد جی نے ہر ممکن کوشش کی کہ میں ڈاکٹری کے علاوہ باقی سارے کام سیکھ جاؤں۔ استاد جی ہر نسخہ مجھ سے چھپا کر لکھتے تھے۔ ان استاد جی کی شاگردی کی بھی ایک بہت طویل اور دلچسپ داستان ہے، جو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

اب ہمارے گھر کے مالی حالات میں بھی کافی بہتری آ چکی تھی اور میں باقاعدہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ گھر والوں سے بات کی تو وہ مان گئے اور میرا داخلہ گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج ،قصور میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) گروپ میں کروا دیا گیا کہ اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا جس نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔

یہ 31 مارچ 1980ء کا دن تھا۔ اس دن میرے دوست سعید احمد کا نویں کا رزلٹ آیا اور وہ پاس ہو گیا۔ گھر آ کر خوشخبری دی، سارے گھر والے خوش تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ خوشی کتنی عارضی ہے۔ اسی روز شام کو اسے کوئی نامعلوم شخص گھر سے بلا کر لے گیا اور پھر سعید احمد کبھی واپس نہ آیا۔ اس روز میں نے اپنی سائیکل پکڑی اور سعید احمد کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی ماں جی نے پریشانی کے عالم میں دروازہ کھولا۔ میں نے جھٹ سے پوچھا، خالہ جی! سعید احمد کدھر ہے؟ ماں جی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کہنے لگیں کل شام سے گھر سے گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پھر ایک دن ہمیں وہ خبر سننے کو ملی جس نے میرے اعصاب شل کر دیے۔ ایک صبح میں سعید احمد کے گھر گیا تو وہاں صف ماتم بچھی تھی۔ معلوم ہوا کہ سعید احمد کو کسی نے قتل کر کے کھڈیاں خاص کے پاس سے گزرنے والی نہر میں پھینک دیا تھا۔ اس کی نعش نہر سے برآمد ہوئی ہے۔

اب ہمارے خلاف سازشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے والد صاحب نے چونکہ علاقے میں الیکشن میں حصہ لے کر روایتی بڑوں کو للکارا تھا اور ہم اپنے گاؤں کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت بنتے جا رہے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے سیاسی مخالف ماسٹر محمد عالم آج کل تھانے کے بہت چکر لگا رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح میرا نام سعید احمد کے قتل کے مقدمہ میں تتمہ بیان کے ذریعہ نامزد کر دیا جائے لیکن سعید احمد کے لواحقین اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ ان کا موقف تھا کہ عبدالغفور کے ساتھ تو ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم کیوں کسی بے گناہ کو مقدمہ میں پھنسائیں۔ ماسٹر محمد عالم جو ہمارے دور کے رشتہ دار بھی تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے گاؤں میں کوئی نیا چودھری پیدا ہو۔ گاؤں میں ہماری حویلی کے سامنے ہماری ہی زمین میں شیشم کا بہت بڑا درخت تھا۔ گاؤں میں اس وقت بجلی نہیں آئی تھی۔ گاؤں کے تقریباً تمام مرد دن کے وقت اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر، اپنی اپنی چارپائی اور اپنا اپنا سرہانہ سروں پر اٹھا کر آرام کرنے کے لئے اس درخت کے نیچے اپنی چارپائیاں بچھا لیتے تھے۔ ہمارے والد صاحب روزانہ دس بجے کے قریب اپنے لیے چند چارپائیاں وہاں لگا دیتے تھے اور ساتھ حقہ بھی تیار کر کے رکھ دیتے۔ دیہات کے لوگ آرام بھی کرتے تھے۔ کچھ لوگ حقہ پیتے تھے اور گپ شپ بھی خوب چلتی رہتی۔ ہم اس شیشم (ٹاہلی) کے درخت پر

بھائی نے کہا: جب ایک بار تم فوج میں بھرتی ہو گئے
تو فوج کبھی تمہیں پولیس کے
حوالے نہیں کرے گی

Scanned with CamScanner

افغانستان فتح کرنے کے بعد روس کا منصوبہ پاکستان پر قبضہ کرنے کا تھا
کیونکہ وہ گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اللہ نے اسے توفیق نہ دی
اور افغان مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا

ساون کے مہینے میں پینگھ بھی ڈالا کرتے تھے اور اس کے جھولوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

اپریل 1980ء کی سولہ یا سترہ تاریخ تھی۔ مذکورہ ٹاہلی کے نیچے حسب معمول مجمع لگا ہوا تھا۔ اچانک ہماری نظر سڑک پر سے گزرتے ہوئے ایک تانگے پر پڑی جس پر پولیس ملازمین سوار تھے۔ وہ تانگہ سیدھا ماسٹر عالم کے گاؤں کوٹ ماسٹر محمد عالم کی طرف جا رہا تھا۔ اتنی دیر میں سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک پولیس اہلکار جو میرے لالہ جی (بڑے بھائی مہر محمد عالم) کا دوست تھا ٹاہلی کے نیچے پہنچا اور لالہ جی کو ایک طرف لے گیا اور ان سے کوئی بات کر کے فوراً واپس چلا گیا۔ لالہ جی بھائی نور احمد نمبردار اور مجھے ساتھ لے کر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر لالہ جی نے فوری طور پر ماموں محمد حنیف کو بھی ان کے گھر سے بلا لیا۔ جب سارے بیٹھ گئے تو ہم سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ لالہ جی نے سکوت توڑا اور بتایا کہ ماسٹر محمد عالم نے غفور کو گرفتار کروانے کے لیے پولیس بلوا لی ہے۔ تھانہ کا ایک اہلکار جو میرا قریبی دوست ہے ابھی مجھے بتا کر گیا ہے۔ ان حالات میں بڑوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہماری بڑی بہن نے مجھے ایک تھیلے میں کپڑوں کے دو سوٹ تھما دیے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنی بڑی بہن کے پاس چلا جاؤں، جن کی شادی چک نمبر 4 ویرم تھانہ پتوکی میں ہوئی تھی۔ میں بہن کے پاس پہنچا اور پھر وہاں سے لاہور کے لیے نکل کھڑا ہوا اور اپنے ماموں زاد بھائی فرزند علی کے پاس جا پہنچا۔

بھائی فرزند علی صاحب مع فیملی رہ رہے تھے اور وہ فوج میں ملازم تھے۔ اس وقت وہ ایک میڈیم رجمنٹ آرٹلری میں رجمنٹ کوارٹر ماسٹر حوالدار کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ فرزند علی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے بعد میرے اس طرح اچانک آنے کی وجہ پوچھنے لگے۔ میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ تھوڑے سے پریشان تو ہوئے لیکن اپنے تاثرات سے انہوں نے بالکل بھی اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی۔ کہنے لگے: ”میں نے ماموں کو اس سے پہلے بھی کئی پیغامات بھیجے ہیں کہ غفور کو فوج میں بھرتی کروا دیا جائے لیکن وہ نہ مانے۔ جب سے تم نے میٹرک پاس کیا ہے تب سے میں کوشش کر رہا ہوں کہ ماموں (میرے والد صاحب) اور پھوپھو (میری والدہ صاحبہ) کو منا لوں کہ وہ تمہیں فوج میں بھرتی کروا دیں۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی“۔ پھر بھائی فرزند علی نے فوج کی نوکری کے فضائل و مناقب اس انداز سے بیان کئے کہ ایسے لگ رہا تھا کہ پوری دنیا میں فوج کی نوکری سے بہتر کوئی ملازمت نہیں اور مجھے مشورہ دیا کہ اب بھی وقت ہے میری بات مان جاؤ اور فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ کہنے لگے، ”میری یونٹ میں ہی بھرتی ہو رہی ہے۔ ٹریننگ بھی لاہور میں یونٹ کے اندر ہی ہو

گی۔ میں بھی یہاں موجود ہوں۔ تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارا پولیس کیس بھی ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ جب ایک بار تم فوج میں بھرتی ہوگئے تو فوج کبھی تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرے گی۔ پھر تم نے کون سا قتل کیا ہوا ہے لیکن پریشانی تو بن گئی ہے ناں۔ اس پریشانی سے بچنے کا فوری حل یہی ہے کہ تم فوج میں بھرتی ہو جاؤ“۔

میں نے کہا: ”بھائی جان کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں نے ایف ایس سی (پری میڈیکل) گروپ میں داخلہ لے لیا ہے۔ میرا خواب تو ڈاکٹر بننے کا ہے۔ آپ مجھے فوج میں سپاہی بھرتی ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں“۔ وہ کہنے لگے: ”فوج میں پڑھنے لکھنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ فوج کا اپنا ایک ایجوکیشن بورڈ ہے جسے آرمڈ فورسز بورڈ فار ایجوکیشن کہتے ہیں۔ اگر تم ایف اے کر لیتے ہو تو فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھی بن سکتے ہو۔ جس کی پرموشن جنرل تک ہوجاتی ہے“۔ دوسرے تیسرے دن میں اور بھائی فرزند علی سائیکل پر بیٹھ کر ان کی یونٹ کی طرف چل دیے۔ مین گیٹ پر پہنچ کر میری انٹری کروائی گئی۔ اس وقت میری یونٹ آر اے بازار، لاہور کے پاس تھی۔ بہت اونچی اونچی اور پرانی اور خستہ حال بیرکیں تھیں جنہیں بعد میں مسمار کر دیا گیا۔ بھائی فرزند علی مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر خود پریڈ پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئے اور مجھے ایک خوبصورت، دراز قد اور گورے چٹے افسر کے دفتر میں لے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخصیت یونٹ صوبیدار میجر محمد عارف تھے۔ انہیں بھائی فرزند نے بتایا کہ میں نے میٹرک سائنس کے ساتھ کیا ہے۔ (یاد رہے کہ اُس وقت سائنس کے ساتھ میٹرک کرنے کی ہمت کوئی کوئی طالبعلم کرتا تھا)۔ ایک باؤ جی آئے (اس وقت فوج میں کلرک کو باؤ جی کہتے تھے) انہوں نے کچھ فارم وغیرہ فل کئے اور میری میٹرک کی سند بھی طلب کی۔ میں نے کہا وہ تو گھر ہے۔ باؤ جی مجھے ایک صوبیدار میجر صاحب کے پاس لے گئے۔ انہیں بتایا کہ یہ جولڑکا بھرتی ہونے کے لئے آیا ہے، اپنے آپ کو میٹرک بتاتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی تعلیمی سند موجود نہیں۔

صوبیدار میجر مجھے ایک افسر (یونٹ کے ایڈجوٹنٹ) کے پاس لے گئے۔ ایڈجوٹنٹ کمانڈنگ آفیسر کا سٹاف آفیسر ہوتا ہے جو پوری یونٹ کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایڈجوٹنٹ صاحب نے مجھ سے چند سوال فزکس اور کیمسٹری کے پوچھے اور ایک دو سوال جنرل نالج کے۔ خوش قسمتی سے میں نے تمام سوالوں کے جوابات درست دیے۔ پھر ایڈجوٹنٹ صاحب کے حکم پر میرا تفصیلی میڈیکل چیک اپ کروایا گیا۔ بہرحال مجھے اور میرے ساتھ دو اور امیدواروں کو میڈیکل افسر نے طبی طور پر پاک آرمی کے لئے موزوں قرار دے دیا۔ ہمیں تین دن کی چھٹی دی گئی اور حکم دیا گیا کہ 23 اپریل

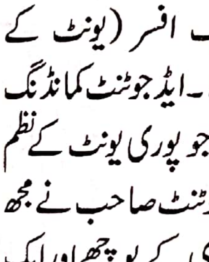

ایک فوجی سپاہی کے لئے اس سے بڑا کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ جو افسر سپاہیوں سے ہاتھ تک ملانا پسند نہ کرتے ہوں وہ اسے گلے سے لگا کر مبارک بادیں دے رہے ہوں

کرنل اقبال نے کہا: ”تمہارے جیسے بندوں کی فوج میں ضرورت نہیں، جاؤ کہیں سول سروس میں قسمت آزمائی کرو“ لیکن یہ سفر بہت لمبا تھا، یہ دن دیکھنے کے لئے مجھے پندرہ سال تک انتظار کرنا پڑا

1980ء کو گھر سے اپنا سامان وغیرہ لے کر واپس یونٹ میں رپورٹ کریں۔ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنی میٹرک کی اصل سند بھی لے کر آؤں۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر بھائی فرزند علی کے کمرے میں گیا اور انہیں بتایا کہ میں بھرتی ہو گیا ہوں، تین دن کی چھٹی دی گئی ہے اور مورخہ 23 اپریل کو واپسی رپورٹ کا کہا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، ”تم آج شام کو ہی نکل جاؤ، رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر۔ دیکھنا! گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلنے پائے ورنہ کام خراب ہو سکتا ہے۔ اپنا ضروری سامان اور میٹرک کی سند لے کر، کل صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی گاؤں سے نکل آنا اور سیدھا میرے گھر پہنچ جانا“۔

میں قینچی سٹاپ لاہور سے بس پر سوار ہو کر کھڈیاں خاص (قصور) پہنچا۔ وہاں سے میرا گھر چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت سواری کا کوئی بندوبست نہیں تھا کیونکہ مغرب کے بعد کوئی تانگہ بھی میرے گاؤں کی طرف نہیں جاتا تھا۔ میں پیدل چل نکلا۔ گھر پہنچا تو گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ میرے اتنی دیر سے اور اچانک گھر پہنچنے پر سارے اہل خانہ پریشان ہو گئے۔ میں نے بتایا کہ میں چک نمبر 4 ویرم سے لاہور بھائی فرزند علی کے پاس چلا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے فوج میں بھرتی کروا دیا ہے۔ والد صاحب پوچھنے لگے کہ کیا بھرتی ہوئے ہو؟ میں نے جواب دیا، ”ٹیکنیکل اسسٹنٹ“۔ گھر والوں نے سوچا کہ یہ ٹیکنیکل اسسٹنٹ فوج کا کوئی افسر ہوتا ہوگا۔ لیکن میں نے انہیں بتایا کہ یہ عہدہ افسر نہیں بلکہ ایک سپاہی کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ سارے گھر والے مجھے اور بھائی فرزند علی کو لعن طعن کرنے لگے۔ پھر ماں جی نے بڑے پیار سے پوچھا: ”پتر! تیری تنخواہ کنی لگی اے؟“ (بیٹا! تمہاری تنخواہ کتنی ہو گی؟) جب میں نے بتایا کہ میری تنخواہ مبلغ 280 روپے ماہانہ ہو گی تو پھر سے ایک شور مچا کہ اتنی کم تنخواہ! میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ بھائی فرزند علی نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے بھرتی کروایا ہے۔ انہوں نے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اب فوج میں بھرتی ہو جانے سے تمہاری پولیس کے مقدمے سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ لالہ جی (بڑے بھائی مہر محمد عالم) غصے سے بولے، ”سعید احمد کو کون سا ہم نے قتل کیا ہے۔ ہم سچے ہیں۔ مقدمہ تو ختم ہونا ہی ہے لیکن تمہیں جو فوج کی عمر قید ہو گئی ہے۔ اب اس کا کیا بنے گا؟“

پھر میں نے پوچھا کہ اس دن میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟ لالہ جی نے بتایا، ”تمہارے گھر سے نکلنے کے دس پندرہ منٹ کے بعد گاؤں کے چوکیدار کے ساتھ دو پولیس ملازم آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ غفور کو بھیجو، اسے ماسٹر عالم کے ڈیرے پر لے کر جانا ہے۔ ہم نے کہا کہ وہ تو گھر پر نہیں ہے تو کہنے لگے کہ آدھ گھنٹہ پہلے تو وہ ٹاہلی کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اب اچانک کہاں چلا گیا ہے؟۔ اس کے کچھ دیر بعد

پولیس سے بھرا ہوا تانگہ ہمارے گھر کے گیٹ پر رکا اور تھانیدار یہ پیغام دے کر چلا گیا کہ غفور کو کل تھانہ کنگن پور میں پیش کریں ورنہ ہم گھر کے سارے مرد حضرات کو اور تمہارے مال مویشی بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔'' میں نے بڑی بے قراری سے پوچھا، ''پھر آپ لوگوں نے کیا کیا؟'' لالہ جی کہنے لگے، میں تھانہ کھڈیاں گیا تھا۔ وہاں پر میرا ایک دوست تھانیدار ہے۔ اس سے بات کی تو اس نے مجھے بتایا کہ یہاں پورے تھانے کو پتہ ہے کہ عبدالغفور بے گناہ ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن ماسٹر محمد عالم آپ کو پھنسانے پر تلا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ذاتی تعلقات استعمال کر رہا ہے بلکہ اس نے ایک بھاری رقم بھی اس مقصد کے لئے ایک پولیس افسر کو دی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ آپ بھی کچھ رقم کا بندوبست کریں۔ میں آپ کی ڈیل کروا دوں گا۔ اب ہم نے اس مقصد کے لئے کچھ رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔''

میں یہ بات سن کر بہت پریشان ہوا۔ لالہ جی سے کہا: ''ہم نے کون سا کوئی جرم کیا ہے کہ ہم پولیس والوں کو پیسے دیں؟ لالہ جی نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا: ''غفور تمہیں نہیں پتہ کہ پاکستان میں کیا نہیں ہوتا۔ ہمارے کیس ہی کو دیکھ لیں۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ لیکن پولیس ہمارے سیاسی مخالف کے کہنے پر تمہیں قتل کیس میں گرفتار کرنے کے درپے ہے۔ یہ ایک مصیبت ہم پر آن پڑی ہے اس سے نکلنا تو ہے۔'' پھر میں نے گھر والوں کو بتایا کہ بھائی فرزند علی نے مجھے کہا تھا کہ کل صبح فجر کی نماز کے بعد گاؤں سے لاہور کے لئے نکل آنا۔ اس لئے مجھے علی الصبح نکلنا ہے۔ ماں جی میری یہ بات سن کر بہت پریشان ہو گئیں۔ دوسری جانب پولیس کیس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش آ گئی تھی تو اس کا سامنا بھی تو کرنا تھا اس لئے ضبط کر گئیں۔ اس طرح میں اپنے والدین اور تمام بہن بھائیوں کی سسکیوں میں صبح فجر کی نماز کے بعد گھر سے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ یوں اپنی چھٹی گزارنے کے بعد میں اگلے دن مغرب سے قبل اپنی یونٹ پہنچ گیا۔ گیٹ پر رپورٹ کی تو وہاں سے رجمنٹ پولیس کا ایک جوان مجھے ایک بیرک میں چھوڑ آیا۔ ہم کل 67 رنگروٹ تھے جس میں ایک میں میٹرک پاس تھا اور دوسرا ٹیکنیکل اسسٹنٹ محمد ارشد تھا۔ باقی سب ان پڑھ تھے۔ ہم تمام لوگوں کو ایک ہی بیرک میں ٹھونس دیا گیا۔

ہمیں خوش خبری سنائی گئی کہ مورخہ 26 اپریل 1980ء سے ہماری باقاعدہ فوجی ٹریننگ کا آغاز ہو رہا ہے۔ چونکہ ہماری ٹریننگ شدید گرمی کے موسم میں ہونا تھی اس لیے ٹریننگ کا ڈریس بنیان بغیر بازو کے، نیکر، بوٹ اور اونی جرابوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ خیر ایک جاں گسل اور سخت ٹریننگ کے بعد ہماری ٹریننگ مکمل ہو گئی۔ ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ مورخہ 16 اکتوبر 1980ء کو ہونا تھی۔ اس کے لئے

دفتری اہلکار نے کہا: ''بھائی قائداعظم کا فون کرواؤ، آپ کا کام فوراً ہو جائے گا'' میں نے استفسار کیا: ''کیا مطلب ہے، قائداعظمؒ تو کب کے دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں؟''

ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس افسر اہلکار پر برسے اور انتہائی ناراضی سے کہا، ''آپ لوگوں کو کیوں اتنا ذلیل کرتے ہو جب کہ فائل بھی مکمل ہوتی ہے، آپ کو خدا کا خوف کیوں نہیں آتا؟''

تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ہمیں چھ ماہ تک مسلسل دن رات رگڑا لگایا گیا اور جوں جوں پاسنگ آؤٹ پریڈ کا دن قریب آرہا تھا اس رگڑے میں بہت زیادہ سختی آگئی تھی۔ سارا دن ڈرل کروائی جاتی تھی اور شام تک تھکاوٹ سے ہمارا برا حال ہو جایا کرتا تھا۔ دن گن گن کر گزارے جا رہے تھے۔ سنا تھا کہ پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد جب ہمیں اپنی اپنی بیٹری میں تعینات کر دیا جائے گا تو ٹریننگ والی سختیاں نہیں ہوں گی۔ ٹریننگ کے اختتام پر بیٹری میں تعیناتی کے بعد بھی میں نے انتہائی محنت اور دل لگا کر کام کیا۔ لاہور میرے گھر سے کافی نزدیک تھا۔ ہر ماہ ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر چلا جاتا تھا۔ ویسے بھی بھائی فرزند علی کے گھر میں خاندان کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لئے گھر کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔

1981ء کی بات ہے کہ ایک دن چونکا دینے وا لی خبر ملی کہ عن قریب میری یونٹ کوہاٹ، صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) جا رہی ہے اور یہ کہ یونٹ کی ایک بیٹری پاراچنار میں بھی ڈیپلائی ہوگی۔ پاراچنار پاک افغان بارڈر پر ایک قصبہ ہے جو افغانستان سے دس پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت روس کی فوجیں افغانستان میں داخل ہو چکی تھیں لیکن مجاہدین کی سخت ترین مزاحمتی جنگ جاری تھی۔ افغانستان کو فتح کرنے کے بعد روس کا منصوبہ پاکستان پر قبضہ کرنا تھا کیونکہ وہ گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اللہ نے اسے توفیق نہ دی اور افغان مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آخر کار لاہور سے کوہاٹ جانے کا شیڈول آگیا اور ہماری یونٹ نے ماہ مئی 1981ء میں لاہور سے کوہاٹ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ جس بیٹری کا میں حصہ ہوں وہ لاہور سے سیدھی پارہ چنار جائے گی۔ پوری یونٹ نے دو ماہ قبل ہی سامان کی پیکنگ شروع کر دی۔ ہم تمام سپاہی سارا دن یونٹ کے سامان کی پیکنگ میں مصروف رہتے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے ہماری چھٹیاں بند کر دی گئی تھیں۔ آخر کار لاہور سے روانگی کا دن آگیا۔ ہم نے اپنا سامان فوجی گاڑیوں میں لادا اور لاہور کینٹ ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر ہماری یونٹ کے لئے مخصوص کی گئی بوگیوں میں رکھ دیا۔ سٹیشن پر ہی ہماری ''فال ان'' ہوئی، گنتی کی گئی۔ ہم ٹرین میں سوار ہوئے اور ٹرین چھک چھک کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔ تین چار دن کے بعد ہم کوہاٹ پہنچ گئے۔ سامان ٹرین سے اتار کر پاراچنار جانے والی ٹرین پر رکھا اور پاراچنار جا پہنچے۔ ہمارا کیمپ پارہ چنار شہر سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر سیبوں کے باغ کے پاس تھا۔ ہماری رہائش زیر زمین بینکرز میں تھی۔ بینکرز کی چھتیں لوہے کی چادروں سے بنی ہوئی تھیں۔ اور ان جستی چادروں کو سہارا دینے کی لئے ان کے نیچے لکڑی کی ''بلیاں'' کھڑی کی تھیں اور ان چادروں کو تیز ہوا کے اثر سے بچانے کے لئے ان کے اوپر بڑے بڑے پتھر رکھے گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

ایک دن میں مورچے میں ڈیوٹی پر تھا۔ میرے چارج میں ہیوی مشین گن تھی جس کی بیلٹ ایک ہزار گولیوں کی تھی۔ مورچے کے اوپر چھت نہ تھی۔ اچانک بارش آ گئی۔ میں نے فوری طور پر مشین گن کو کلوز کیا۔ گن کو کاندھے پر رکھا اور ایمونیشن بیگ کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر اپنے بنکر کی طرف بھاگا تاکہ مشین گن بارش کے پانی سے بھیگ نہ جائے۔ جلدی سے بینکر میں داخل ہوا۔ سیڑھیاں اترا، اندر اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ اچانک یوں ہوا کہ میری کاندھے پر رکھی ہوئی مشین گن ٹن کی چادروں کو سہارا دینے والی ایک "بلی" سے ٹکرائی اور آناً فاناً بینکر کے ایک حصے کی چھت کی جستی چادریں نیچے گرنا شروع ہو گئیں اور ان کے اوپر رکھے پتھر بھی دھڑام دھڑام کر کے نیچے گرنا شروع ہو گئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس اثناء میں میں نیچے گر گیا۔ میں جونہی گرا ایک جستی چادر مرے اوپر اس طرح گری کہ وہ گرتے ہی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور میرے لیے شیلٹر بن گئی ورنہ جتنے بڑے بڑے پتھر چھت کے اوپر سے گر رہے تھے۔ ایک ہی پتھر میرا کام تمام کرنے کے لئے کافی تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات نے مجھے بال بال بچا لیا۔ میری بیٹری کے سارے لوگ بارش کی وجہ سے اپنے اپنے بینکرز میں گھسے ہوئے تھے لیکن جستی چادروں پر پتھروں کے گرنے کی شدید آوازیں سن کر دوڑ کر اس بینکر پر پہنچے جس کے اندر میں گرا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جلدی جلدی سے اور بڑی احتیاط کے ساتھ تمام پتھر ہٹائے اور چادروں کو ایک طرف کر کے مجھے نیچے سے نکالا۔ تمام لوگ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔

افغانستان بارڈر پر پاکستان کا آخری گاؤں ''تری مینگل'' ہے۔ اس گاؤں کے قریب پہاڑوں پر تقریباً ایک کلومیٹر چڑھائی پر ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہماری یونٹ کی آبزرویشن پوسٹ (او۔پی) تھی۔ وہاں پر ایک جے سی او (جونیئر کمیشنڈ آفیسر)، ایک ٹی اے (ٹیکنیکل اسسٹنٹ) اور ایک او سی یو (آپریٹر کمیونیکیشن یونٹ) کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ اگست 81ء میں میری ڈیوٹی وہاں لگائی گئی، میرے ساتھ صوبیدار محمد سلیمان اور او سی یو محمد اختر کی ڈیوٹی لگی۔ گاؤں ''تری مینگل'' تک تو ہمیں فوجی گاڑی میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے او۔پی (ابزرویشن پوسٹ) تک اپنا بستر اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی تک پیدل چڑھنا تھا۔ خیر، ہم وہاں پہنچے، اپنے اپنے سامان کا چارج لیا اور پہلے والے لوگوں کو واپس روانہ کر دیا۔ یہ پوسٹ اس علاقہ کی بلند ترین چوٹی پر تھی اور افغانستان کے علاقہ میں تھی۔ یہاں کے سٹاف کے فرائض میں شامل تھا کہ ہر گھنٹے بعد دشمن کی نقل و حرکت سے اپنی یونٹ کو بذریعہ وائرلیس معلومات فراہم کی جائیں۔ کسی بھی خطرے یا ایمرجنسی کی صورت میں یونٹ سے گولہ باری کی صورت میں کمک مانگی جائے۔

ایک دن دو بجے کے قریب ہم اپنے بنکر سے باہر بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے کہ افغانستان کی

میں نے ادارے کے تمام ہڈ حرام، کام چور اور بغیر کام کئے تنخواہ وصول کرنے والے ملازمین کی حاضری کو یقینی بنا کر ان کو کام پر لگا دیا

Scanned with CamScanner

یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عدالت میں زیر التوا مقدمات کی تعداد ہزاروں میں تھی اور پچھلے تین سالوں میں نمٹائے گئے مقدمات صرف چند سو ہی تھے

طرف سے ایک روسی ہیلی کاپٹر انتہائی نیچی پرواز سے ہماری پوسٹ کے اوپر آیا۔ ہمارے پاس انٹی ایئر کرافٹ مشین گن تھی۔ صوبیدار صاحب نے گنر کو اس ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی لیکن یہ کیا؟ ہیلی کاپٹر پر ان گنت گولیاں فائر کی گئیں۔ گولیاں بالکل اس کے اوپر لگ رہی تھیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ وہ روسی ساختہ بلٹ پروف ہیلی کاپٹر تھا۔ ہم حیران تھے کہ ہیلی کاپٹر نے وہاں آ کر کوئی کارروائی نہ کی اور واپس چلا گیا اور ہمیں اللہ کی ذات نے محفوظ رکھا۔

ایک دن ہم اپنے بنکر کے اندر بیٹھے تھے کہ ایک بم کا دھماکہ ہوا۔ ہم دوربین لے کر اپنے بینکر سے باہر نکلے تاکہ دیکھا جاسکے کہ بم کہاں گرا ہے اور اس سے کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم نے اس کی رپورٹ اپنے ہیڈکوارٹر کو دینا تھی۔ اتنی دیر میں ہمارے بینکر کے قریب ہی توپ کا ایک اور گولہ گرا۔ ہم سب فوری طور پر زمین پر لیٹ گئے۔ بعد میں صوبیدار صاحب کے حکم سے پیٹ کے بل ''کرالنگ'' کر کے اپنے بنکرز میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد توپ کا ایک اور گولہ ہمارے بنکر کے بالکل قریب آ کر گرا۔ اس سے اڑنے والی دھول ہمارے بنکر کے دروازے سے اندر آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اب ہم سارے سہمے ہوئے تھے کہ دشمن کا اگلا ٹارگٹ ہمارا بنکر ہوگا۔ گولہ ہمارے بنکر کے عین اوپر گرے گا اور ہم یقیناً شہید کے رتبے پر فائز ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد دشمن کی طرف سے کوئی گولہ نہ آیا، شاید دشمن نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی گولہ باری سے ہمارا بنکر تباہ ہو چکا ہے۔ اس ابزرویشن پوسٹ میں ہم نے ایک مہینہ موت کے منہ میں گزارا اور افغان روس جنگ کو نہایت قریب سے دیکھا۔ ہماری بیٹری نے پاراچنار میں ایک سالہ مدت پوری کی۔ اس کے بعد ہماری جگہ کسی اور بیٹری کو بھیج دیا گیا اور ہماری بیٹری کو کوہاٹ واپس بلا لیا گیا۔

میں فوج میں مختلف تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا رہا۔ اپنے سرکاری کاموں سے بڑی مشکل سے فرصت نکال کر اپنی تقریریں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا تھا اور اس میں اپنے سینئرز سے بھرپور رہنمائی بھی لیتا رہتا۔ میں فوج میں نوکری تو کر رہا تھا لیکن مجھے اپنا مستقبل روشن نہیں لگ رہا تھا۔ ہر وقت سوچتا رہتا کہ مجھے ایسا کیا کرنا چاہئے کہ میں ترقی کر سکوں۔ وہاں رہ کر میری ترقی زیادہ سے زیادہ صوبیدار میجر تک ہوجاتی، زیادہ بھی تیر مار لیتا تو آنریری (اعزازی) کیپٹن بن پاتا۔ ایک دن میری ملاقات محمد اقبال (ٹیکنیکل اسسٹنٹ) رومیو بیٹری سے ہوئی۔ یہ بعد میں آنریری کیپٹن ریٹائر ہوئے۔ انہیں انگریزی بولنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے آتے ہی میرے ساتھ انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ ایک دن کہنے لگے: ''کیا یہاں پڑے پڑے گلتے رہنے کا ارادہ ہے! ہمارے جیسے پڑھے لوگوں کا

یہاں کیا مستقبل ہے''۔عرض کرتا چلوں کہ اس وقت میٹرک پاس کر جانا ایک معنی رکھتا تھا۔دوسرا یہ کہ فوج میں اس وقت نچلے رینکس میں میٹرک پاس لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی تھی۔میں نے اقبال سے پوچھا، پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو کہنے لگا:''سب سے پہلے تو ہمیں اپنی انگریزی بول چال بہتر کرنی چاہیے اور انگریزی گرامر وغیرہ سیکھنی چاہیے۔دوسرا یہ کہ ہمیں پرائیویٹ ایف اے کرنا چاہیے۔پھر آرمی میں کمیشن کے لئے اپلائی کرنا چاہیے''۔

اپریل 1983ء میں مَیں میپ ریڈنگ (فوجی نقشہ بینی) کی کلاس اٹینڈ کر رہا تھا۔اس وقت ملک عبداللہ صاحب (نائب صوبیدار) ہماری یونٹ کے ایجوکیشن جے سی او ہوا کرتے تھے۔انتہائی نفیس اور پڑھے لکھے انسان تھے۔اس وقت ان کی تعلیم ایم اے اکنامکس تھی، میرے تو وہ محسن تھے۔ایک دن وہ ہماری کلاس چیک کرنے کے لئے آئے۔ہم سب کی کاپیاں ایک میز پر پڑی تھیں۔انہوں نے ہماری کاپیاں چیک کرنی شروع کیں، میری کاپی کھولی تو وہ کلاس کی سب سے خوبصورت کاپی تھی۔میری اردو اور انگریزی کی لکھائی بہت اچھی تھی، کاپی دیکھ کر متاثر ہوئے۔کلاس میں ان کی آواز گونجی: ٹی اے عبدالغفور کون ہے؟ میں کھڑا ہو گیا۔انہوں نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔کہنے لگے:''تمہاری تعلیم کتنی ہے؟''میں نے انہیں بتایا کہ میں نے میٹرک سائنس کیا ہے۔کہنے لگے، تم ایف اے کیوں نہیں کر لیتے ہو؟ میں نے گزارش کی، سر! آپ کو پتہ ہے کہ میں سپاہی ہوں۔سپاہیوں کو کہاں پڑھنے کا وقت ملتا ہے؟۔میری یہ بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے،''اگر آپ کو پشاور میں ڈویژنل ایجوکیشن سکول میں ایف اے کرنے کے لئے بھیج دیا جائے تو چلے جاؤ گے؟ وہاں ایف اے کی ریگولر کلاس چل رہی ہے۔''میں نے عرض کی، ''آپ مہربانی فرما دیں۔میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔''انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں کمانڈنگ آفیسر (کرنل) سے بات کرتا ہوں۔

اگلے دن عبداللہ صاحب پھر ہماری کلاس میں آئے، مجھے بلایا اور بتانے لگے کہ ان کی کرنل محمد سلیم (کمانڈنگ آفیسر) سے بات ہو گئی ہے۔پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے:''میں کل یہاں سے سیدھا سی او صاحب کے پاس گیا تھا اور انہیں بتایا کہ سر! ہمارا ایک ٹی اے ہے جو ایف اے کرنا چاہتا ہے۔پشاور میں ایف اے کی کلاس چل رہی ہے۔اگر ہم اسے وہاں بھیج دیں تو شاید اس کا مستقبل بن جائے۔انہوں نے پوچھا کہ کون سا ٹی اے؟ تو میں نے انہیں تمہارا نام بتایا تو کہنے لگے یہ کہیں وہی لڑکا تو نہیں جس نے اپنی بریگیڈ میں زبردست تقریر کی تھی؟''بہرکیف، ان حضرات کا مجھ پر احسان تھا کہ انہوں نے اگلے ہی دن مجھے میرا موومنٹ آرڈر تھما

افسران اپنی ایمانداری اور دیانتداری کا ڈھنڈورہ بھی پیٹتے ہیں اور سائلین کو برسہا برس ذلیل وخوار بھی کرتے ہیں اور ایسے افسران اس بات پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ پیسے نہیں لیتے اور ایماندار ہیں

Scanned with CamScanner

میں نے اپنے سٹاف سے کہا، بھائی جس نے کام کرنا ہے وہ یہاں رہے، جس نے کام نہیں کرنا وہ اپنا تبادلہ یہاں سے کروا لے، میرے ہوتے ہوئے دفتر آنے کا ٹائم ہوگا جانے کا کوئی ٹائم نہیں ہوگا

دیا اور میں پشاور میں ڈویژنل ایجوکیشن سکول چلا گیا۔

اس وقت ڈویژنل ایجوکیشن سکول پشاور کے انچارج میجر اختر رندھاوا تھے اور صوبیدار شوکت علی (آرمی ایجوکیشن کور) سکول کے انچارج جے سی او تھے۔ میں صوبیدار شوکت صاحب سے ملا اور انہیں اپنی یونٹ کی طرف سے جاری کردہ چٹھی دی اور کہا کہ ”سر! میں ایف اے کرنا چاہتا ہوں“۔ صوبیدار صاحب بہت ہی مشفق، نیک، متقی، پرہیزگار، پابند صوم وصلوٰۃ اور باشرع آدمی تھے، کہنے لگے: ”بیٹا آپ تو بہت لیٹ آئے ہیں۔ ہم اس سکول میں ایف اے کی کلاس صرف بیس ہفتے کی چلاتے ہیں۔ آج کلاس کا نواں ہفتہ شروع ہو چکا ہے۔ ہم طلبا کو آدھے سے زیادہ سلیبس پڑھا چکے ہیں۔ اگر آپ کو ہم رکھتے ہیں تو آپ کلاس کے ساتھ نہیں چل پائیں گے اور ہمارے سکول کا رزلٹ خراب ہونے کا امکان ہوگا“۔ میں نے منت کرنے کے انداز میں کہا: ”سر! میں بڑی مشکلوں سے اپنی یونٹ سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ مجھے دوبارہ چانس ملنا ناممکن ہے۔ آپ مہربانی فرمائیں مجھے موقع دیں میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا“۔ میری باتیں سن کر صوبیدار صاحب کے دل میں رحم آ گیا۔ پوچھنے لگے: ”تمہارا میٹرک سائنس کے ساتھ ہے یا آرٹس کے ساتھ؟ اور میٹرک میں کتنے نمبر تھے؟“ میں نے بتایا کہ میرا میٹرک سائنس کے ساتھ ہے اور میرے میٹرک میں 559 نمبر تھے۔ کہنے لگے اس کے لئے تو میجر صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔ پھر کہنے لگے ہم آپ کو مشروط طور پر ایک ہفتے کے لئے کلاس میں بٹھا لیتے ہیں اگر تمہاری پرفارمنس ٹھیک ہوئی تو آپ کو کلاس جاری رکھنے کی اجازت دے دیں گے ورنہ آپ کو فارغ کر دیں گے۔ صوبیدار صاحب نے مجھے کلاس میں بھیج دیا۔

کلاس میں تیس کے قریب لڑکے تھے۔ ایک لڑکا تھا جس کا نام تھا دلدار حسین۔ یہ ملٹری پولیس کا نائیک تھا۔ کلاس میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ وہ لائق بھی تھا اور اس کی انگریزی کی لکھائی بھی اچھی تھی۔ میں نے بہت سے انگریزی کے الفاظ کی بناوٹ اس سے سیکھی۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ وہ شام کو اکثر ہماری بیرک میں آ جاتا اور ہم اکٹھے پڑھا کرتے۔ پورا ہفتہ میں نے خوب دل لگا کر پڑھا کیونکہ مجھے ادراک تھا کہ میرا مستقبل اس ہفتے کی محنت میں پوشیدہ ہے۔

اللہ نے مجھ پر اپنا خاص کرم کیا۔ اگلے ہفتے شیڈول کے مطابق ہمارا مطالعہ پاکستان کا پیپر تھا۔ پورے ہفتے میں جو پڑھایا گیا تھا اس میں سے ٹیسٹ لیا جانا تھا۔ میری تیاری ٹھیک تھی۔ اگلے دن جب رزلٹ سنایا گیا تو دلدار حسین فرسٹ آ گیا اور میں کلاس میں سیکنڈ آیا۔ صوبیدار شوکت صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ حوصلہ افزائی کی اور شاباش دی۔ یہ بھی کہا کہ تم اسی طرح محنت کرتے رہو گے تو بہت

اچھا رزلٹ لے سکتے ہو۔ پڑھائی اور محنت کا سلسلہ یونہی شب و روز جاری رہا۔ میں نے ایف اے میں سیاسیات، اسلامیات اختیاری اور میپ ریڈنگ (فوجی نقشہ بینی) کے اختیاری مضامین لئے تھے۔ باقی دو اختیاری مضامین تو سکول میں پڑھائے جاتے تھے لیکن میپ ریڈنگ نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے میپ ریڈنگ میں بہت محنت کی اور صوبیدار شوکت صاحب جیسی نہایت شفیق ہستی میسر آئی جنہوں نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔

ایف اے کے امتحانات سر پر آ گئے، ہم نے زبردست تیاری کی اور امتحانات دے دیئے۔ اب میرا اپنی یونٹ میں واپسی کا دن آ گیا۔ واپسی سے ایک دن قبل میں نے عصر کی نماز اسی مسجد میں ادا کی جہاں صوبیدار شوکت علی صاحب رہائش پذیر تھے۔ صوبیدار صاحب اپنی سرکاری رہائش جے سی او میس کے بجائے مسجد کے حجرے میں رہتے تھے کیونکہ وہ سرکاری ڈیوٹی کے بعد تمام وقت یادِ الٰہی میں ہی صرف کر دیتے تھے۔ بڑے اللہ والے انسان تھے۔ وہ مجھے اپنے حجرے میں لے گئے جہاں کوئی چارپائی نہ تھی۔ موصوف فرشی بستر پر ہی سویا کرتے۔ کمرے میں انتہائی بوسیدہ حالت میں لیکن صاف ستھرے دو عدد گول تکیے بھی تھے۔ انہوں نے مسجد کے خادم کو چائے لانے کا کہا۔ میں نے شوکت صاحب سے کہا: ''سر! کل میں واپس جا رہا ہوں۔ آپ کو خصوصی طور پر ملنے آیا ہوں کہ آپ کی مہربانیوں، شفقتوں، محبتوں اور راہنمائیوں کا شکریہ ادا کر سکوں۔ آپ میرے عظیم محسن ہیں''۔ صوبیدار صاحب کہنے لگے، ''بیٹا! میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا کیونکہ میں تنخواہ ہی اسی کام کی لیتا ہوں۔ بس آپ نماز پڑھ کر میرے لیے بھی دعا کر دیا کرنا اور یاد رکھنا ماں باپ کی دعا سے بڑھ کر کوئی دعا نہیں ہوتی۔ والدین کی موجودگی میں کسی پیر سے دعا کروانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہی سب سے بڑے پیر ہوتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں کیونکہ آپ ذہین بچے ہو۔ مجھے اللہ کے گھر سے امید ہے کہ تمہاری آرمڈ فورسز بورڈ میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور آئے گی''۔ میں نے کہا سر! وہ کیسے؟ کہنے لگے: ''بس مجھے تمہاری محنت سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے''۔

میں اپنی یونٹ میں واپس کوہاٹ آ گیا۔ سب سے پہلے اپنے محسن نائب صوبیدار ملک محمد عبداللہ، ایجوکیشن جے سی او سے ملا۔ انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ میرے پیپرز کیسے ہوئے؟ میں نے انہیں بتایا کہ سر! میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر یونٹ کے کمانڈنگ افسر سے بات کر کے مجھے سرکاری ایجوکیشن گرانٹ سے بی اے کی کتب منگوا کر دیں اور ساتھ حکم دیا کہ جب بھی وقت ملے کچھ نہ کچھ پڑھ لیا کرنا۔

جنوری 1984ء میں اپنے ٹریڈ کی کلاس اٹینڈ کر رہا تھا۔ دیکھا کہ محترم عبداللہ صاحب بڑے تیز

ایک اسکینڈل 1970ء کی دہائی میں آیا جس میں بے شمار مالیاتی ادارے کھلے جنہوں نے غیر قانونی بینکنگ کا کام شروع کیا، لوگوں سے سرمایہ کاری کے نام پر اور بھاری منافع کا وعدہ کر کے ان کا مال لوٹ لیا

Scanned with CamScanner

5 نومبر 1991ء تک حکومت پنجاب اور محکمہ کوآپریٹوز کی ملی بھگت سے سادہ لوح عوام سے ''شیئرز'' کے نام پر اور بھاری منافع کا لالچ دے کر رقمیں لوٹیں اس کے ساتھ سیاستدانوں کو ناقابل واپسی قرضے بھی دیے جاتے رہے

تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری کلاس کی طرف آ رہے ہیں۔ انہوں نے قریب پہنچ کر مجھے بلایا، مبارکباد دی اور گلے سے لگالیا اور کہنے لگے، ''غفور تم پاس ہوگئے ہو''۔ میں نے سے پوچھا، ''سر! کیا میں صرف پاس ہوا ہوں؟''۔ انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: ''آرمڈ فورسز بورڈ فار ہائر ایجوکیشن، جی ایچ کیو، راولپنڈی کی طرف سے لئے گئے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں (جس میں پاک آرمی، پاکستان ایئر فورس اور پاکستان نیوی کے طلبا نے شرکت کی) آپ نے 753 نمبر حاصل کر کے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ آپ نے سابقہ ریکارڈ جو 728 نمبر کا تھا توڑ دیا ہے''۔

پھر عبداللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ میں یہ خوشخبری کرنل محمد سلیم، کمانڈنگ افیسر کو دے کر آیا ہوں۔ انہوں نے تمہیں بلایا ہے۔ میں نے فوراً اپنی ٹوپی سر پر پہنی۔ یونیفارم کو سیٹ کیا اور عبداللہ صاحب کے ساتھ سی او صاحب کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں چل نہیں رہا بلکہ ہوا میں تیرتا ہوا جا رہا ہوں۔ میرے قدم زمیں پر نہیں لگ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ جب سی او صاحب کے دفتر پہنچے تو میرے پہنچنے سے پہلے انہوں نے تمام بیٹری کمانڈرز کو اپنے دفتر بلایا ہوا تھا۔ جب میں عبداللہ صاحب کے پیچھے پیچھے کرنل صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر اپنے دفتری میز کی دوسری طرف آئے اور مجھے گلے سے لگایا، میرا ماتھا چوما اور مبارک باد۔ پھر تمام بیٹری کمانڈرز نے باری باری مجھے اپنے سینے سے لگا کر مبارک باد دی۔ ایک فوجی سپاہی کے لئے اس سے بڑا کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ جو افسر سپاہیوں سے ہاتھ تک ملانا پسند نہ کرتے ہوں وہ اسے گلے سے لگا کر مبارک بادیں دے رہے ہوں۔ کرنل صاحب نے ساتھ ہی ایک لفافہ میری طرف بڑھایا اور کہنے لگے، ''غفور! اس لفافے میں مبلغ پانچ صدروپیہ ہے۔ یہ آپ کا انعام ہے''۔

اب کرنل صاحب نے ایک اور اعلان کیا۔ انہوں نے مجھے سپاہی سے ترقی دے کر ''اَن پیڈ لانس نائیک'' بنا دیا۔ فوجی اصطلاح میں ''اَن پیڈ'' سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص رینک تو لگائے گا لیکن اس کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوگا۔ کرنل صاحب نے یہ بھی اعلان کیا کہ مجھے رینک پوری یونٹ کے سامنے لگایا جائے گا۔ جس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ اس کی پوری یونٹ کے لوگوں کے سامنے عزت بڑھے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کے لئے موٹیویشن بھی ملے گی۔

پھر میں نے فوج ہی میں بی اے کی تیاری شروع کر لی اور 1986ء میں بی اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے بطور پرائیویٹ امیدوار، فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ جس دن میرا بی اے کا رزلٹ آیا اس سے اگلے دن پاک آرمی میں ایجوکیشن جے سی او کے مقابلے کے امتحان کے لئے

اپلائی کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ میں نے اس امتحان کے لیے اپلائی کر دیا۔ مجھے ایجوکیشن جے سی او کے مقابلے کے امتحان کی کال آ گئی۔ امتحانی سنٹر راولپنڈی میں تھا وہاں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ اپنے پرانے محسن کرنل راجہ محمد سلیم صاحب کے پاس گیا۔ یہ ان دنوں راولپنڈی میں ٹرانسفر ہو چکے تھے۔ انہوں نے میری رہائش اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔ جب امتحانی سنٹر پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑا مایوس ہوا کہ کل 36 سیٹیں تھیں جبکہ ہزاروں امیدوار تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پرسنالٹی والے لوگ تھے، ہشاش بشاش چہرے اور فر فر انگریزی بولنے والے۔ آرمی کے علاوہ سول امیدوار بھی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس پڑھے لکھے ہجوم میں میری سلیکشن تو ناممکن ہی لگتی ہے لیکن میں نے اللہ کو یاد کر کے پیپر دے دیئے۔

اس امتحانی سنٹر میں ایک دلچسپ شخصیت تھی۔ نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا لیکن انہیں صوبیدار خاندانی صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ جوں جوں رزلٹ کا وقت قریب آ رہا تھا، دل کی دھڑکن بے ترتیب اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آخر مقررہ وقت پر صوبیدار خاندانی صاحب اپنی ٹیم کے ہمراہ تشریف لائے اور ہمیں فال ان ہونے کا حکم دیا گیا۔ پھر صوبیدار صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑے لفافے میں سے ایک فہرست نکالی اور حکم دیا کہ وہ جس امیدوار کا نام پکاریں وہ ان کی دائیں طرف قطار بنا کر کھڑا ہوتا جائے۔ جب صوبیدار صاحب فہرست میں مذکور نام سنا چکے تو تمام امیدوار دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ کہنے لگے: ''آپ کے سامنے میں نے دو گروپ بنا دیئے ہیں۔ ایک گروپ تحریری امتحان میں کامیاب ہونے والوں کا ہے اور دوسرا گروپ ناکام ہونے والوں کا''۔ پھر انہوں نے پاس اور فیل ہونے والے امیدواروں کا اعلان بڑے دلچسپ انداز سے کیا۔ انہوں نے اس دوسرے گروپ کو جس میں مَیں شامل نہیں تھا۔ ہوشیار باش ہونے کا حکم دیا۔ ذرا سا توقف کیا۔ پھر حکم دیا ''داہنے پھر''۔ جب وہ گروپ دائیں جانب پھر گیا تو پھر صوبیدار صاحب کی آواز گونجی ''جلدی چل۔ دوڑے چل اور اگلے سال پھر آ جانا''۔ صوبیدار صاحب کا یہ حکم سننے کے بعد نہ صرف کامیاب ہونے والے بلکہ ناکام ہونے والے امیدواران بھی قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ یوں انہوں نے فیل ہونے والے امیدواروں کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

اگلے دن میں انٹرویو کے لیے جی ایچ کیو گیا اور انٹرویو دے کر واپس کوہاٹ اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد رزلٹ آ گیا اور میری ایجوکیشن جے سی او (جونیئر کمیشنڈ آفیسر) کے طور پر سلیکشن ہو گئی۔ یہ خبر میری یونٹ میں آگ کی طرح پھیل گئی اور یونٹ کے ہر فرد نے مجھے مبارک باد دی۔ میرے لیے میری یونٹ نے بڑے کھانے کا اہتمام کیا جس میں یونٹ کے تمام افسران، جے سی او صاحبان اور

وہ دن میری زندگی کا یادگار دن تھا، اس رات میں جتنی سکون کی نیند سویا شاید پوری زندگی ایسی نیند نہ سویا ہوں، کیوں کہ میں نے ایک بے سہارا اور بے گناہ شخص کو اللہ کی مہربانی سے فوری انصاف فراہم کیا

سوسائٹی سیکنڈل کا ڈسا ہوا آدمی بری ہوا تو کہنے لگا:

"سر! آج کا دن اور وقت نوٹ کر لیں آپ کو سید نے دعا دے دی ہے، اللہ نے آپ کو ڈپٹی کمشنر بنانا ہے، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ!"

جوانان شامل ہوئے اور مجھے یونٹ کی طرف سے گفٹ دے کر الوداع کیا گیا۔ مجھے ایجوکیشن جے سی او کی ابتدائی تربیت کے لئے سکول (اب کالج) آف آرمی ایجوکیشن، اپر ٹوپہ، مری ہلز میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔03 مئی 1986ء کو ہماری ٹریننگ شروع ہوئی اور 4 ستمبر 86ء کو پاسنگ آؤٹ ہوئی۔ ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ کے وقت ہم سب کو نائب صوبیدار کے رینک کے بیجز لگائے گئے۔ میں اپنے بیچ کا سب سے کم عمر نائب صوبیدار تھا۔ اس وقت آرمی میں میری سروس ساڑھے چھ سال ہو چکی تھی۔ میں نے جے سی او بننے کے بعد بھی اپنی محنت ترک نہ کی حالانکہ جے سی او بننے کے بعد جوان کا سٹیٹس تبدیل ہو جاتا ہے۔

وہ لنگر بھی بجائے جے سی او میس میں کھانا کھاتا ہے۔ بیرکوں کی بجائے اس کی رہائش جے سی او میس میں ہوتی ہے۔ ایک جوان کی خدمات بطور "بیٹ مین" اس کو دی جاتی تھیں۔ اس کے نام کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگ جاتا ہے وغیرہ۔ وغیرہ۔ لیکن میں اسے اپنی منزل نہ سمجھا کیونکہ میری منزل کچھ اور تھی۔ میں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی سے پہلے بی۔ ایڈ کی ڈگری اور اس کے بعد ایم اے اسلامک سٹڈیز کی ڈگری لی۔ 1989ء میں میری پوسٹنگ لاہور میں ایک سگنل کی بٹالین میں بطور ایجوکیشن جے سی او ہو گئی۔ میں کور سنٹرل سکول، لاہور میں ایف اے اور میٹرک کی کلاسز کو انگریزی پڑھاتا رہا۔ 1991ء میں میرا تبادلہ لاہور سے بہاولپور میں ایک بلوچ رجمنٹ میں بطور ایجوکیشن جے سی او ہو گیا۔ میں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ایم اے انگلش پارٹ ون کا داخلہ بھیج دیا۔ امتحان دیا اور اللہ کے فضل و کرم سے تمام پرچوں میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ اگلے سال یعنی 1993ء میں ایم اے انگلش۔ پارٹ ٹو کا امتحان دیا اور میں نے ایم اے انگلش کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ میں نے کون سا معرکہ مارا ہے۔ اب تو ایم اے میں لوگ اے اور اے پلس گریڈ لے رہے ہیں۔ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت ایم اے انگلش واحد مضمون تھا جس کی کسی سرکاری نوکری کے لیے اپلائی کرنے کے لئے تھرڈ ڈویژن بھی قابل قبول تھی۔

1993ء میں مجھ سے دو بڑی غلطیاں ہوئیں:

اس سال ایک تو میں نے ایم اے انگلش پارٹ ٹو کا امتحان دیا، وہ تو پاس ہو گیا۔ ساتھ ہی بغیر مکمل تیاری کے سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحانات بھی اسی سال دے دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے فوج جیسی ٹف نوکری بھی کرنا تھی اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنی تھی۔ لیکن الحمد للہ جب جذبے صادق ہوں، ہمت جوان ہو اور اپنے اہداف کے حصول کے لیے اخلاص سے کام لیا جا رہا ہو تو ساری مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

سی ایس ایس میں میرے نمبر 548/1100 آئے اور میرا ایگریگیٹ نہ بن سکا۔ سی ایس ایس میں میرے نمبر 550 آتے تو میں امتحان کوالیفائی کر جاتا۔ یوں میں صرف دو نمبروں سے رہ گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ پی سی ایس کے امتحان میں مطالعہ پاکستان میں میرے 31/100 نمبر آئے۔ باقی سارے پرچے پاس تھے اور اچھے نمبروں میں پاس تھے لیکن میں فیل ہو گیا۔ کیونکہ مقابلے کے ان دونوں امتحانات میں ایک تو امیدوار کو تمام پرچوں میں انفرادی طور پر پاس ہونا ہوتا ہے دوسرا اس کے کل حاصل کردہ نمبر کل نمبروں کا کم از کم 50 فی صد ہونے چاہئیں۔ میرے اگر مطالعہ پاکستان میں 31 کی بجائے 33 نمبر آتے تو میں امتحان کوالیفائی کر جاتا۔ میں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو بتایا ''سر! میں صرف دو نمبروں سے پی سی ایس کے امتحان میں فیل ہو گیا ہوں اور فیل بھی مطالعہ پاکستان میں ہوا''۔ انہوں نے فوری طور پر ایک چٹھی سیکرٹری پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور کو لکھی جس میں استدعا کی گئی کہ یا تو میرے مطالعہ پاکستان کے پیپر کی ری چیکنگ کی جائے یا مجھے گریس مارکس (صرف دو نمبر) دے کر پاس کر دیا جائے۔ چند دنوں بعد اس چٹھی کا جواب آ گیا جس میں تحریر تھا کہ پی پی ایس سی کے رولز کے مطابق نہ تو پیپرز کی ری چیکنگ کی جا سکتی ہے اور نہ ہی گریس مارکس دیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور پی سی ایس-1994 کے مقابلے کے امتحان میں پھر بیٹھ گیا۔ اور خدائے بزرگ و برتر کی مہربانی سے اس امتحان میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوا اور کرنل محمد اقبال، آئی سپیشلسٹ، جنہوں نے مجھے فوج میں کمیشن کے لئے طبی طور پر ان فٹ قرار دیا تھا کی بات سچ ثابت ہوئی جو انہوں نے کہا تھا،'' تمہارے جیسے بندوں کی فوج میں ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ کہیں سول سروس میں قسمت آزمائی کرو۔'' لیکن یہ سفر بہت لمبا تھا۔ یہ دن دیکھنے کے لئے مجھے پندرہ سال کے طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑا۔

اس امتحان میں میرا میرٹ بہت اچھا نہ تھا اس لئے میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نہ بن سکا بلکہ میری تعیناتی میرٹ کے مطابق بطور اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز ہوئی۔ اس وقت میری تعیناتی بہاولپور میں ایک پنجاب رجمنٹ میں بطور ایجوکیشن جے سی او تھی۔ یونٹ میں جب پتہ چلا تو ایک جشن کا سماں تھا۔ مجھے یونٹ نے اپنی شاندار روایات کے مطابق بڑے شایان شان طریقے سے الوداع کیا۔ میں اپنے سنٹر کالج آف آرمی ایجوکیشن، اپر ٹوپہ مری ہلز گیا۔ اپنی سلیکشن کے ضروری کاغذات متعلقہ افسران کو دیئے اور یوں مجھے 25 جولائی 1995ء کو پاک فوج سے ''رہا'' کر دیا گیا۔ اس وقت فوج میں میری سروس پندرہ سال، تین ماہ اور پانچ دن تھی۔ یعنی پندرہ سال سے زیادہ۔ تو میں پاک آرمی سے پنشن کا حقدار ٹھہرا۔ یہی میرے اللہ کی مصلحت تھی جو

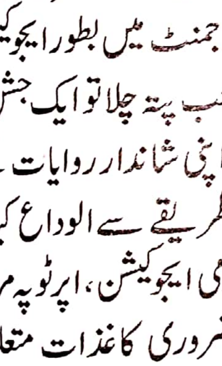

جب بھی کوئی امتحانی پرچہ حل کر رہا ہوتا تھا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت میری مدد کر رہی ہے، مجھے وہ وہ چیزیں بھی یاد آ جاتی تھیں جو میں نے سالوں پہلے پڑھی ہوئی تھیں

جب میرا پی سی ایس 96 کے مقابلے کے امتحان کا رزلٹ آیا تو شاہ صاحب جیسے بے سہارا اور مجبور لوگوں کی دعاؤں کے سبب میں تحریری امتحان میں پورے صوبہ پنجاب میں فرسٹ آیا

مجھے ایک سال پہلے سمجھ نہیں آرہی تھی کیونکہ ایک سال پہلے اگر میں آرمی کو خیر باد کہتا تھا تو مجھے آرمی سروس کی پنشن نہیں ملنا تھی۔

میں نے 1994ء میں پی سی ایس مقابلے کا امتحان پاس کیا تو میرا میرٹ تھوڑا نیچے تھا اس لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن نے مجھے اسسٹنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائٹیز) تعینات کرنے کی سفارش کی اور حکومت پنجاب نے میری تعیناتی کر دی اور مجھے ایک خالی سیٹ پر اسسٹنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائٹیز) تحصیل پاکپتن تعینات کردیا۔ ساتھ ہی مجھے اور میرے ساتھ نئے تعینات ہونے والے افسران کو محکمانہ ٹریننگ کے لیے کوآپریٹو ٹریننگ کالج فیصل آباد بھیج دیا۔ ہم ٹریننگ تو فیصل آباد میں کر رہے تھے لیکن ہمیں تنخواہیں اپنی تعیناتی والی جگہ سے ملنا تھیں۔ کسی سرکاری ملازم کے تقرر کے بعد اسے اپنی پہلی تنخواہ جاری کروانے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس والے تنخواہ کے بلوں پر کیسے کیسے اعتراضات لگاتے ہیں، نو آموز ملازمین کو کتنے چکر لگواتے ہیں، ان کو کتنا ذلیل وخوار کرتے ہیں، ان اعتراضات کے پیچھے کیا محرکات ہوتے ہیں اور یہی بظاہر نہ حل ہونے والے اعتراضات ان کی مٹھی گرم کرنے کے بعد کتنی سرعت سے ختم ہوتے ہیں، یہ تو صرف وہی شخص جانتا ہے جو اس اذیت سے گزرا ہو۔ ہمارے ارباب بست وکشاد بھی اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن اس کا مداوا کرنے کے لیے صرف زبانی جمع تفریق کی جاتی رہی ہے، عملی طور پر کبھی کچھ نہیں۔ اگرچہ باقی تمام محکمہ جات کے حالات بھی اس سے کچھ مختلف نہیں لیکن ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس والوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔

میں اپنی تنخواہ جاری کروانے کے لیے کالج سے چھٹی لے کر پاکپتن گیا۔ ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس پاک پتن والوں نے مجھے دو دن تک اتنا خجل خراب کیا کہ الامان والحفیظ۔ میں سول سروس میں نو وارد تھا، اس لیے بہت پریشان ہوا۔ اعتراضات پر اعتراضات۔ فلاں دستاویز لاؤ، فلاں لاؤ۔ وہ لے کر گیا تو کسی دیگر دستاویز کی ڈیمانڈ کردی جاتی۔ چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا، میں وہاں نزدیکی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ دو دن پریشانی کے عالم میں گزار کر شام کو تھک ہار کر واپس چلا گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد خالق کائنات سے دعا کی: ''اے مالک کائنات! آپ نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا اور ہر مشکل وقت میں میری مشکل کشائی فرمائی ہے، کیوں کہ آپ کے علاوہ کوئی مشکل کشا اور حاجت روا نہیں۔ آپ مسبب الاسباب ہو، اس مشکل وقت اور پریشانی میں بھی میری مدد فرما''۔ میں نے یہ دعا مانگی اور سو گیا۔

آپ یقین کریں کہ میرے دل سے خلوص نیت سے نکلی ہوئی میری دعا کو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات

نے قبولیت بخشی۔ اگلے دن میں پریشانی کے عالم میں اکاؤنٹس آفس پہنچا۔ وہ میری چھٹی کا آخری دن تھا۔ اللہ کی طرف سے ایک معجزہ رونما ہوا۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس دفتر کا ایک اہلکار خود بخود اللہ کے حکم سے میرے پاس آ گیا۔ وہ گزشتہ دو دنوں سے مجھے خوار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا مسئلہ پوچھا۔ میں نے تفصیل بتائی تو کہنے لگا: ”بھائی! جب تک آپ پاکستانی طریقہ اختیار نہیں کریں گے، اعتراضات لگتے رہیں گے“۔

مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ میں نے اس سے کہا، ”بھائی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا، بھائی قائداعظم کا فون کرواؤ۔ آپ کا کام فوراً ہو جائے گا“۔ میں نے استفسار کیا: ”کیا مطلب ہے، قائداعظم تو کب کے دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ میں ان سے فون کیسے کرواؤں؟ ایسا کرنے کے لئے تو مجھے بھی ان کے پاس جانا پڑے گا لیکن فی الحال میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ میں نے تو ابھی افسری دیکھی بھی نہیں“۔ وہ مسکرایا اور بولا، ”بھائی اللہ آپ کو سلامت رکھے، میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا“۔ پھر کہنے لگا، ”بھائی میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس دفتر کے ملازمین کی خدمت کئے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں؟ میں نے کہا، ”میرے پاس کوئی زیادہ پیسے تو نہیں۔ بس میرے اپنے خرچ کے لیے کافی ہوں گے“۔ اس کو اصل بات سمجھ آ گئی کہ پارٹی پیسے والی نہیں ہے۔ فوراً اللہ کی مہربانی سے وہ تو بڑا ہمدرد اور نیک دل انسان بن گیا۔ اس نے مجھے ایک دفتر میں بٹھا دیا اور مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کہا، ”اب آپ کا کام ہو جائے گا۔ میں نے اس دفتر کے سب سے بڑے افسر سے بات کی ہے۔ ان کو سب کچھ بتا دیا ہے کہ دفتری اہلکاران دو دن سے کس طرح آپ کو پریشان کر رہے ہیں؟“ وہ مجھے ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس افسر پاک پتن کے دفتر لے گیا۔ افسر موصوف بہت ملنسار، نیک دل اور فرض شناس انسان نظر آئے۔ مجھے بیٹھنے کا کہا اور میرا مسئلہ پوچھا۔ میں نے اپنی فائل ان کے سامنے رکھ دی، انہوں نے فائل ملاحظہ کی۔ دفتر کی گھنٹی بجائی۔ اردلی آیا تو انہوں نے کسی دفتری اہلکار کو بلا کر لانے کا کہا، متعلقہ اہلکار آیا تو وہی اہلکار تھا جو دو دن سے مجھے ذلیل کر رہا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے میری طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا۔ اتنی دیر میں ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس افسر اس پر برسے اور انتہائی ناراضی سے کہا، ”آپ لوگوں کو کیوں اتنا ذلیل کرتے ہو جب کہ فائل بھی مکمل ہوتی ہے، آپ کو خدا کا خوف کیوں نہیں آتا؟ اور پھر اس کو بڑی سختی سے حکم دیا، ”جاؤ اور فوری طور پر اس شریف آدمی کی پے سلپ بنا کر لاؤ“۔ وہ، ”تعمیل حکم ہوتی ہے سر!“ کا کہہ کر چلا گیا

کچھ لوگ دیگر تکنیکی داؤ پیچ سیکھ کر افسران بالا

کے منظور نظر بن کر افسری

کے مزے لوٹتے ہیں

ملازمت کی خواہش رکھنے والے جان لیں کہ پاکستان میں سرکاری ملازمت ان لوگوں کے لیے ہرگز پھولوں کی سیج نہیں جو میرٹ پر کام کرنا چاہتے ہیں

اور تقریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رجسٹر تھا۔ مجھے اس رجسٹر میں دستخط کرنے کا کہا۔ اس نے جہاں پر انگلی رکھی میں نے وہاں دستخط کر دیئے تو اس نے بڑے مہذب اور مؤدب طریقہ سے ایک کاغذ کا ٹکڑا مجھے تھما دیا جسے ''پے سلپ'' کہتے ہیں۔ میں نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا۔ پھر افسر موصوف کا بھی شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر نکلا اور اس دفتری اہلکار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے''۔

میں اکاؤنٹس آفس سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ انسان کیوں گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، کیوں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے؟ اپنے اللہ کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتا جب کہ اللہ رب العالمین نے قرآن کریم فرقان حمید میں فرما دیا ہے، ''میں انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہوں'' اور ساتھ یہ بھی فرما دیا، ''جب کوئی انسان مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی آواز سنتا ہوں اور اسے جواب بھی دیتا ہوں'' تو پھر ہمیں اللہ کی باتوں پر یقین کیوں نہیں آتا؟ اس لیے کہ ہمارے عقائد بہت کمزور ہیں۔ ہم محض اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے، والدین نے ہمارا نام مسلمانوں والا رکھ دیا اور بس۔ اگر میرے جیسے گنہگار انسان کی دعا اللہ کے ہاں شرف قبولیت پا سکتی ہے تو باقی مسلمانوں کی کیوں نہیں؟ دراصل ہم نے مانگنے کے لیے اللہ کے علاوہ بھی کچھ اور در بھی بنا لئے ہیں اور ہماری دعائیں شائد یقین کامل اور خلوص نیت سے بھی خالی ہوتی ہیں۔ میں اسی دن واپس فیصل آباد چلا گیا اور اپنی ٹریننگ جائن کر لی۔ تقریباً دو ماہ گزرے ہوں گے کہ مجھے سول سیکریٹریٹ لاہور سے خاکی لفافہ موصول ہوا۔ لفافہ کھولا تو اسے پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حکومت پنجاب نے مجھے بے سہارا سمجھ کر میرے گھر سے بہت ہی دور بطور مینیجر/ کوآپریٹو ایکسٹینشن آفیسر، پاک جرمن انسٹیٹیوٹ فار کوآپریٹو ایگری کلچر۔ چک نمبر 5 فیض ضلع ملتان تعینات کر دیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اچھی اور گھر کے نزدیک پوسٹنگ کے لیے کوئی سیاسی یا بیوروکریٹک سفارش نہ تھی اور محکمہ کا کوئی بھی افسر مذکورہ ادارے میں کام کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میرے باقی تمام ساتھی افسران کو پہلے ہی ان کی خواہش کے مطابق پوسٹنگ دے دی گئی تھی جن میں سے میرے بہت سارے ساتھی افسران اس وقت سے لے کر آج تک لاہور میں اپنی مرضی کی پوسٹنگ پر کام کر رہے ہیں۔

اس وقت میری ٹریننگ کے ابھی چار ماہ باقی تھے۔ پاکپتن میں جس ذہنی اذیت سے میں دو چار ہوا تھا مجھے اس کا صدمہ ابھی تک نہ بھولا تھا۔ اب مجھے پھر سے پاکپتن جانا تھا اور چارج چھوڑنا تھا۔ اپنا آخری تنخواہ کا سرٹیفکیٹ لینا تھا اور پھر ملتان میں پہلے والا پراسیس نئے سرے سے ہونا تھا۔ لیکن محکمہ کے ارباب اختیار کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ سروس

Scanned with CamScanner

میں ایک نو وارد افسر کے لیے اس کو تبدیل کرنے سے کتنے مسائل پیدا ہوں گے اور کس اذیت میں مبتلا ہوگا۔ انہوں نے تو سفارشی لوگوں کو ان کی من پسند پوسٹنگ دینا ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ رکھا تھا۔ حالانکہ صاحبان اختیار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ افسران کی پوسٹنگ ٹرانسفر کے حوالے سے کوئی قابل عمل پالیسی بنائیں اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ بہرحال میں نے ہمیشہ کی طرح پوسٹنگ/ ٹرانسفر کے معاملات اللہ وحدہ لاشریک کے سپرد کر کے اپنی نئی تعیناتی کی جگہ پر جائن کر کے کام کرنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ واحد ذات ہے جو اپنے بندوں کے لیے بہترین فیصلے کرنے والی ہے۔

ٹریننگ ختم ہونے کے بعد میں چک نمبر 5۔ فیض، ملتان پہنچا اور چارج رپورٹ بھری۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب کے دفتر گیا، وہ دفتر میں موجود نہ تھے۔ پتہ چلا کہ موصوف ہفتہ میں ایک یا دو دن کے لیے دفتر تشریف لاتے ہیں۔ میں انسٹیٹیوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو گیا۔ دو دن بعد پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب تشریف لائے اور میری طلبی ہوئی۔ کافی لمبے انٹرویو کے بعد میری جائننگ ہوئی۔ انہوں نے کہا، ”اگرچہ آپ ناتجربہ کار افسر ہیں، لیکن یہاں آپ کے علاوہ کوئی اور انتظامی افسر نہیں ہے اس لیے ادارہ آپ نے ہی چلانا ہے۔ میں بیمار آدمی ہوں۔ ملتان سے آنا ہوتا ہے، کبھی کبھی میں بھی دفتر آجایا کروں گا۔ ضروری ڈاک میرے گھر ملتان میں بھجوا دیا کرنا۔ دیکھنا! دھیان سے کام کرنا۔ کوئی شکایت نہ آئے“۔

میں نے کہا، ”سر! آپ فکر نہ کریں۔ میں ان شاء اللہ آپ کی توقعات سے بڑھ کر کام کروں گا“

میں ناتجربہ کار تھا۔ نیا نیا افسر بنا تھا، کوئی گائیڈ کرنے والا بھی نہ تھا، پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب بھی تقریباً غیر حاضر افسر تھے لیکن سہولیات سے بھی زیادہ فوائد حاصل کر رہے تھے۔ میں نے حوصلہ نہ ہارا اور اللہ کا نام لے کر ایک ”قریب المرگ“ ادارے میں کام شروع کر دیا اور اس ادارے کو از سر نو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اللہ کی مہربانی سے اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ میں نے ادارے کے تمام ہڈحرام، کام چور اور بغیر کام کیے تنخواہ وصول کرنے والے ملازمین کی حاضری کو یقینی بنا کر ان کو کام پر لگا دیا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ملازمین صرف اپنی تنخواہ کی وصولی کے لیے مہینہ میں ایک دن ادارے میں رونق افروز ہو کر انسٹیٹیوٹ کی رونق دوبالا کرتے تھے۔ اس وقت جن لوگوں نے میرے ساتھ کام کیا وہ اس حقیقت کے عینی شاہد ہیں۔

وہاں مجھے صرف چند ایک ایسے افسر ملے جو ذہین، محنتی اور ایمانداری سے کام کرنے والے تھے، ان میں سے ایک زبیر وحید صاحب بھی تھے جو اس وقت وہاں پر زراعت افسر تھے۔ وہ اب ایک پی ایم

دفتر کے ملازمین میں سے مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ زون کے ڈپٹی میئر صاحب کی رہائش بھی چوک یتیم خانہ میں ہے اور ان کے زیادہ تر ووٹر اور سپورٹر اسی علاقہ سے ہیں

ڈپٹی میئر صاحب کہنے لگے،" آپ کو نہیں پتہ کہ زون کا انچارج ڈپٹی میئر ہوتا ہے؟ آپ نے میری اجازت کے بغیر چوک یتیم خانہ میں کیسے ریڈ کی؟ آپ کو نہیں پتہ کہ میرا گھر بھی ادھر ہے اور میرا حلقہ انتخاب بھی یہی علاقہ ہے؟"

ایس (پی ایس ایس) آفیسر (ایڈیشنل سیکرٹری) ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر پی سی ایس امتحان کی تیاری کی، امتحان دیا اور مالک کائنات کی مہربانی سے کامیابی حاصل کی۔ میری تعیناتی بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول) اور ان کی تعیناتی پنجاب سول سیکرٹریٹ میں بطور سیکشن افسر ہوئی۔ افسر موصوف میرے کہنے، ترغیب دینے اور حوصلہ افزائی کرنے پر ہی مذکورہ امتحان دینے کے لئے تیار ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ اب ان کا ایک بیٹا جس کا نام بلال زبیر ہے، بھی ایک پی ایم ایس افسر ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ 1994ء کے پی سی ایس مقابلے کے امتحان میں میرٹ کم ہونے کی وجہ سے میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول) نہ بن سکا بلکہ میری تعیناتی بطور اسسٹنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائٹیز) ہوئی۔ محکمہ کوآپریٹوز (امداد باہمی) پنجاب جائن کیا اور ٹریننگ کے لیے فیصل آباد چلا گیا اور ٹریننگ ختم ہونے پر میں نے اپنی جائے تعیناتی پر کارسرکار سرانجام دینے شروع کر دیئے۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور پھر سے مقابلہ کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور دوبارہ سے تیاری شروع کر دی۔ پی سی ایس 1995ء کا مقابلے کا امتحان بوجہ ٹریننگ نہ دے سکا اور پی سی ایس (ایگزیکٹو) 1996ء کا امتحان دوبارہ کے لیے تیاری شروع کر دی۔ 1996ء ہی میں مجھے " جوڈیشل افسر پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن" تعینات کر دیا گیا۔ اسی دوران 1996ء کے پی سی ایس امتحانات کی تیاری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے پاس اپنا تبادلہ کروانے کے لئے کوئی سیاسی یا بیوروکریٹک سفارش نہیں تھی لیکن جب اللہ تعالے نے کسی انسان سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو وہ اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں ایک دن اپنے دفتر میں کارسرکار میں مصروف تھا کہ محترم اسد شاہ کھگہ، جو اس وقت انسٹیٹیوٹ کے پراجیکٹ ڈائریکٹر تھے، کا اردلی میرے پاس آیا اور بتایا کہ مجھے پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے میرے بیٹھتے ہی فوراً سوال کیا۔" آپ کا سفارشی کون ہے؟" میں نے کہا، " سر، اللہ کے علاوہ میرا تو کوئی سفارشی نہیں"۔ ان کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ دوبارہ پوچھا،" آپ سفارشی کا نام کیوں چھپا رہے ہیں؟" میں نے کہا، " سر اگر میری کوئی سفارش ہوتی تو میں آپ کو ضرور بتاتا"۔ پھر میں نے پوچھا،" سر آخر ہوا کیا ہے جو آپ بار بار مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں؟" میں اندر ہی اندر سے ڈر بھی رہا تھا اور پریشان بھی تھا کہ کوئی " کٹا" ہی نہ کھل جائے کیونکہ مذکورہ افسر بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور شنید یہ تھی کہ وہ اکثر سرکاری ملازمین کو بلا کر بہت زیادہ بے عزت کیا کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک آدھ دن دفتر تشریف

لاتے تھے لیکن وہ دن سرکاری ملازمین کے لیے بہت بھاری ہوتا تھا ماسوائے ادارے کے اکاؤنٹنٹ کے۔ وہ ملازمین کو بے عزت کرنے کا پورے ہفتے کا کوٹہ ایک ہی دن میں پورا کر جاتے تھے لیکن میرے ساتھ ان کا رویہ قدرے بہتر تھا۔ پوچھنے لگے، ''آپ نے یہاں سے اپنا تبادلہ کیوں کروایا ہے؟ یہاں آپ کو کوئی مسئلہ تھا تو آپ مجھے بتاتے۔ آپ نے آتے ہی ادارے میں ایک جان سی ڈال دی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ لیکن......''۔ میں نے کہا سر، ''لیکن کیا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی''۔ اس پر فرمانے لگے: ''جناب رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کا فون آیا ہے۔ انہوں نے آپ کا تبادلہ'' پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' لاہور میں بطور جوڈیشل آفیسر کر دیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کل صبح لاہور جا کر جناب رجسٹرار صاحب کو ملیں اور اپنی نئی ڈیوٹی جائن کریں''۔ انہوں نے مجھے مزید کہا: ''آپ ابھی چارج چھوڑیں اور کل صبح لاہور جا کر رجسٹرار صاحب کے دفتر رپورٹ کریں''۔

ایک وضاحت کرتا چلوں کہ ان دنوں یہ سیٹ محکمہ کے تمام افسران کی من پسند تھی، محکمہ کا تقریباً ہر افسر یہی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس کو یہ سیٹ مل جائے۔ کیونکہ اس وقت پورے صوبہ پنجاب میں صرف ایک ہی جوڈیشل افسر برائے پنجاب لیکوڈیشن بورڈ تعینات ہوتا تھا جس کے پاس لامحدود اختیارات ہوتے تھے۔ ان اختیارات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جوڈیشل افسر کے فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت کا اختیار صرف اور صرف کوآپریٹو جج، لاہور ہائیکورٹ کو تھا۔

جب میں نے پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب سے آرڈرز کی کاپی مانگی تو کہنے لگے، ''آرڈرز تو ابھی تک نہیں پہنچے لیکن آپ چارج رپورٹ پر آرڈر نمبر کی جگہ خالی چھوڑ دیں۔ چارج رپورٹ پر دستخط کریں، ہم آرڈرز کا نمبر بعد میں لکھ لیں گے۔ آپ فوری طور پر لاہور کے لیے نکل جائیں اور دیکھنا سستی نہ کرنا۔ کل علی الصبح رجسٹرار صاحب کو جا کر رپورٹ کرنا، میری نوکری کا معاملہ ہے''۔ میں نے کہا سر، ''آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی''۔ میں اسی دن بحکم پراجیکٹ ڈائریکٹر، وہاں سے لاہور روانہ ہو گیا۔ رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کا دفتر ان دنوں بینک سکوائرز نزد نیلا گنبد لاہور میں تھا۔ اگلے دن میں ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت جناب نجیب اللہ ملک جو کہ ایک ڈی ایم جی (اب پی اے ایس) افسر تھے بطور رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کام کر رہے تھے اور جناب محمد الیاس مفتی ان کے دفتر میں بطور اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمن) اپنے فرائض منصبی سر انجام دے رہے تھے۔ محترم مفتی محمد الیاس صاحب بڑے وضعدار، تحمل مزاج، نیک دل، ایماندار اور اپنے کام کے ماہر افسر تھے۔ میں جا کر انہیں ملا اور

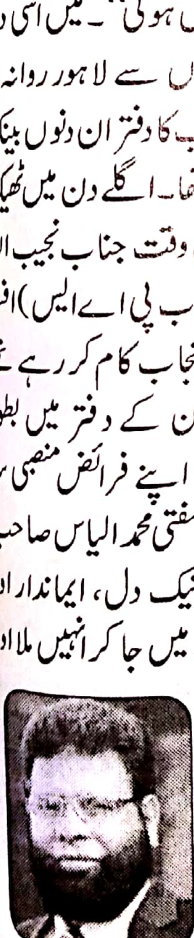

ڈپٹی میسٹر نے کہا: آپ نے اگر اس زون میں نوکری کرنی ہے تو یہاں پر جو میں چاہوں گا وہی ہوگا اور خبردار اگر سٹور کیپر کے خلاف کوئی کارروائی کی، اگر کارروائی کرنی ہے تو میرے خلاف کرو

میں نے اپنے کیریئر کے دوران افسر شاہی اور سیاستدانوں کے گٹھ جوڑ، کرپشن اور دیگر مفادات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا

اپنے تبادلہ کا بتایا۔ انہوں نے مجھے بتایا، ”آپ کی نئی پوسٹنگ میرے کہنے پر ہی ہوئی ہے“۔ میں نے ان سے کہا، ”سر! آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“۔

کہنے لگے: ”میری آپ سے صرف دو ملاقاتیں ہوئی ہیں: ایک جب میں اپنی تعیناتی کے وقت آپ کے پاس جائننگ دینے آیا تھا۔ دوسرا جب میں آپ سے اپنی جائننگ رپورٹ کی کاپی لینے آیا تھا“۔ فرمانے لگے، ”میرے بھائی ہم ہیڈ آفس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری نظر ہر افسر پر ہوتی ہے۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کون سا افسر فیلڈ میں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے کہا: ”سر! میں تو چند ماہ پہلے ہی اپنی ابتدائی ٹریننگ سے فارغ ہوا ہوں۔ ابھی تو اس محکمہ میں، میں نے کام کی ابتدا ہی کی ہے۔ مجھے محکمانہ کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ میں اتنی بڑی سیٹ پر کام کیسے کروں گا؟ میری نوکری کی تو ابھی شروعات ہیں“۔ مفتی صاحب کہنے لگے، ”مجھے قوی امید ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے اس سیٹ پر کامیابی سے کام کریں گے“۔ میں نے ان سے پوچھا، ”سر! میری یہاں پوسٹنگ اتنی اچانک کیسے ہوئی؟“ تو کہنے لگے: ”یہاں پر ہم نے ایک افسر کو کسی سیاستدان کی سفارش پر لگایا ہوا تھا، وہ کافی دیر سے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان کی کافی شکایات آتی رہتی تھیں، لیکن ان کی سفارش اتنی تگڑی تھی کہ ہم بے بس تھے۔ کل اچانک جناب سیکرٹری کوآپریٹوز کا فون آیا۔ انہوں نے رجسٹرار صاحب کو حکم دیا کہ افسر موصوف سے آج ہی جوڈیشل افسر کا چارج چھڑوایا جائے اور اس کی جگہ پر کوئی کام کرنے والا ایماندار افسر فوری تعینات کیا جائے“۔ مزید کہا کہ، ”فوری طور پر کسی کام کرنے والے دیانتدار افسر کا نام بتاؤ تاکہ جناب سیکرٹری صاحب کے حکم کی تعمیل ہو سکے تو میں نے فوری طور پر آپ کا نام لے دیا۔ رجسٹرار صاحب نے پوچھا کہ اس افسر کی سروس کتنی ہے؟ تو میں نے بتایا کہ تقریباً نو دس ماہ۔ کہنے لگے کہ کیا وہ اتنی بڑی اور اہم سیٹ پر کام کر لے گا؟ میں نے انہیں یقین دلایا کہ سر! مجھے قوی یقین ہے کہ یہ افسر بڑے ہی احسن طریقہ سے اور دیانتداری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرے گا اور ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ تو رجسٹرار صاحب نے تبادلہ و تعیناتی کے آرڈرز جاری کرنے کا حکم صادر فرما دیا“۔

مجھے محترم الیاس مفتی صاحب ساتھ لے کر جناب رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کے پاس لے گئے اور میرا تعارف کروایا۔ جناب رجسٹرار نے میرا مختصر انٹرویو لیا اور فرمانے لگے: ”اس سیٹ پر پہلے کام کرنے والے افسر کی مختلف شعبوں سے شکایات موصول ہو رہی تھیں اس لیے ان کو تبدیل کر دیا گیا۔ اگرچہ آپ کی سروس اور تجربہ نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن الیاس مفتی صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی ہے اور ساتھ یہ یقین دہانی بھی کروائی ہے کہ آپ اس دفتر و عدالت کو صحیح طرح سے چلالیں گے تو ہم نے آپ کو یہاں تعینات کر دیا ہے۔ اس لیے

Scanned with CamScanner

آپ کو ہماری توقعات پر پورا اترنا ہوگا تاکہ ہم سیکرٹری کوآپریٹوز کے سامنے سرخرو ہوسکیں''۔

میں نے کہا،''سر! بلاشبہ یہ میری سروس کا آغاز ہے۔ مجھے تجربہ بھی کوئی نہیں ہے لیکن سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے دن رات ایک کر کے کام سیکھوں گا اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ اور انشاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا اور آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا''۔ یہ سن کر رجسٹرار نے اپنی نیک خواہشات کے اظہار کے ساتھ بطور جوڈیشل افسر دی پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن کام کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسی دن لیکوڈیشن بورڈ میں جائن کیا اور اپنے سٹاف کی میٹنگ کال کی۔

ان سے سابقہ افسر کے تبادلے کی وجہ پوچھی۔ تو جو کچھ انہوں نے بتایا وہ ایک مقدس امانت ہے اس کی تفصیل یہاں نہیں بتائی جاسکتی۔ میں نے عدالت میں زیرالتوا مقدمات کی تفصیل پوچھی۔ یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عدالت میں زیرالتوا مقدمات کی تعداد ہزاروں میں تھی اور پچھلے تین سالوں میں نمٹائے گئے مقدمات صرف چند سو ہی تھے۔ میں نے عملے سے پوچھا کہ افسر موصوف کتنا وقت عدالت کو دیتے تھے۔ پتہ چلا کہ موصوف کا عدالت میں آنے اور جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ ان کی دیگر مصروفیات بھی کافی تھیں۔ عدالت کو بہت کم وقت دیتے، عدالت کی کوئی کازلسٹ نہیں بنتی تھی۔ جو لوگ عدالت میں حاضر ہو جاتے ان کی فائلوں پر احکامات لکھ دیے جاتے۔ باقی فائلیں سرد خانے کی نذر ہو جاتیں۔ صرف مخصوص فائلوں ہی پر عدالتی کارروائی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ عدالت میں نہ تو مقدمات کا رجسٹر مکمل تھا اور نہ سٹور میں پڑی ہوئی فائلوں کو مقدمات نمبر لگے ہوئے تھے۔

قارئین کو بتاتا چلوں خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی سروس کے دوران جس دفتر میں بھی جا کر چارج سنبھالا ماسوائے چند مستثنیات کے، دفاتر کی حالت کم وبیش وہی تھی جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ کیونکہ ہمارے پیارے ملک میں شاید لوگ سرکاری ملازمت حاصل ہی اس لیے کرتے ہیں کہ کام نہ کرنا پڑے۔ تن آسانی، ہڈحرامی، سستی، کاہلی، بددیانتی، بے ایمانی اور صرف اس فائل کو ہاتھ لگانا جس سے ذاتی مفاد وابستہ ہو، ہمارے ملازمین کا وطیرہ بن چکا ہے۔ یہاں فائلوں کو سالہا سال تک نہ نمٹانے والے افسران ایمانداری اور دیانتداری کا لبادہ پہن کر اس کا ڈھنڈورہ بھی پیٹتے ہیں اور سائلین کو برسہا برس ذلیل وخوار بھی کرتے ہیں اور ایسے افسران اس بات پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ پیسے نہیں لیتے اور ایماندار ہیں۔ ایسے نام نہاد ایماندار نہ تو سرکار کا کوئی کام کرتے اور نہ ہی عوام الناس کو کوئی ریلیف فراہم کرتے ہیں اور سرکاری سہولیات پوری کی پوری بلکہ اس سے بھی زیادہ حاصل کرتے ہیں۔ خصوصی

مجسٹریٹ نے ڈپٹی میئر سے کہا: جس کی آپ نے سفارش کی تھی اس کو میں نے ایک سو روپیہ، دوسرے کو دو صد روپیہ جرمانہ کیا ہے جس کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا اس کو ''فل ڈوز'' دینی ہے، اس کو پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کیا ہے

ڈپٹی میئر صاحب کی آنکھوں میں جھانکا، ان کی آنکھوں سے شرمندگی سی عیاں تھی، لیکن زبان سے اپنی غلطی اور غیر قانونی حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے

طور پر سرکار کی طرف سے دیئے گئے بجٹ پر ان کی خاص نظر ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسے لوگ سرکاری وسائل کے استعمال میں انتہا درجے کے بددیانت ہوتے ہیں۔ ایسی نام نہاد ایمانداری اور دیانتداری کا کیا فائدہ کہ لوگوں کو اپنے جائز اور قانونی کاموں کے لئے سالہا سال تک دفاتر/عدالتوں کے چکر لگانے پڑیں۔ کسی کا جائز کام بھی نہ ہو سکے اور سائلین حق پر ہونے کے باوجود ذہنی اذیت اور کوفت میں مبتلا ہوں اور دفاتر/عدالتوں میں دھکے کھاتے کھاتے اپنے ارمانوں، خواہشوں اور حسرتوں سمیت اس دار فانی ہی سے کوچ کر جائیں۔ پھر ان کی آنیوالی نسلیں بھی اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیئے از سر نو عدالتوں/ دفاتر کا طواف شروع کر دیں۔

میں نے اپنے سٹاف سے کہا کہ بھائی جس نے کام کرنا ہے وہ یہاں رہے، جس نے کام نہیں کرنا وہ اپنا تبادلہ یہاں سے کروالے۔ میرے ہوتے ہوئے دفتر آنے کا ٹائم ہوگا جانے کا کوئی ٹائم نہیں ہوگا۔ اب یہاں صرف اور صرف کام کرنا ہوگا۔ اگر کوئی یہاں کام نہیں کرسکتا اور اپنا تبادلہ بھی نہیں کرواسکتا وہ مجھے بتا دے، میں اس معاملہ میں اس کی مدد کردوں گا۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا، ”سر! ہم آپ کے زیر سایہ ہی کام کریں گے۔ آپ جتنا کام کہیں گے، ہم کریں گے“۔ ماتحتوں کے اس طرح کے جذبات جان کر مجھے خوشگوار حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

میں نے انہیں کہا کہ کل صبح ٹھیک آٹھ بجے آپ سب لوگ دفتر میں موجود ہوں۔ اگلے دن تمام ملازمین بروقت دفتر پہنچ گئے اور میں بھی وقت مقررہ پر دفتر پہنچ گیا۔ تمام ملازمین کو حکم دیا کہ سب سے پہلے عدالت میں موجود تمام فائلوں کو دو دن کے اندر اندر رجسٹر میں درج کریں اور ان کو نمبر الاٹ کریں۔ ریڈر سے کہا کہ مجھے متعلقہ قوانین کی ایک کاپی اور چند ایسی فائلیں لا کر دے جن پر فیصلے ہو چکے تھے، اس نے حکم کی تعمیل کی۔ یقین جانئے میں نے دو دنوں کے اندر اندر تمام متعلقہ قوانین اور سابقہ فیصلہ جات پڑھ لیئے۔ تیسرے ہی دن ایک سو کے قریب مسئول علیہان کو نوٹس برائے سماعت جاری کردیئے۔

یہاں پر قارئین کے علم میں اضافے کے لیے بتاتا چلوں کہ ”پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن“ کیا ہے؟۔ اس کی تشکیل کے کیا اغراض ومقاصد تھے؟ اس کے اختیارات اور فرائض کیا ہیں؟ یہ ایک بہت ہی المناک داستان ہے۔ یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہماری حکومتیں صرف وہ کام کرتی ہیں جن کی وجہ سے ان کا ووٹ بینک بڑھے یا انہیں مالی فوائد حاصل ہوں۔ آج تک کسی بھی حکومت نے عوامی اور قومی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی پالیسی نہیں بنائی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوام عالم میں صرف ان اقوام نے سرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کیں جنہوں نے پالیسی سازی کے وقت اجتماعی

عوامی مفاد کو مدنظر رکھا اور اجتماعیت کو انفرادیت پر ترجیح دی۔ لیکن ہمارے ملک میں اس کے معرض وجود میں آنے سے لے کر آج تک تقریباً جتنی بھی پالیسیاں بنائی گئیں ان کے در پردہ قومی کی بجائے گروہی یا ذاتی مفاد کارفرما تھا۔ یہاں جتنے بھی مالی سکینڈل آئے ان کا ''کھرا'' حکومت کی طرف ہی جاتا ہے۔ بالآخر نقصان عوام ہی کا ہوتا ہے۔ باقی سکینڈلز اپنی جگہ لیکن ایک مالی اسکینڈل 1970ء کی دہائی میں آیا جس میں ملک عظیم میں سینکڑوں کی تعداد میں مالیاتی ادارے کھلے جنہوں نے غیر قانونی طور پر بینکنگ کا کام شروع کیا۔ لوگوں سے سرمایہ کاری کے نام پر اور بھاری منافع اور سود دینے کا وعدہ کر کے ان کا مال لوٹا گیا۔ حکومت نے ان اداروں سے لوٹا ہوا مال عوام کو واپس دلانے کا وعدہ کیا لیکن عوام کو ذلت کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ حکومت ایسے اداروں کو غیر قانونی کام کرنے کا موقع ہی کیوں دیتی ہے؟ جب ایسے ادارے عوام کو لوٹ رہے ہوتے ہیں اس وقت حکومتیں اپنی آنکھیں کیوں موند لیتی ہیں؟ اس کا جواب ہے۔ نااہلی، بد نیتی، بد دیانتی اور ذاتی مفادات۔

اسی طرح کا ایک ہوش ربا سکینڈل 80ء کی دہائی میں ''کوآپریٹو اسکینڈل'' کے نام سے سامنے آیا۔ حکومت کے من پسند لوگوں نے کل 102 کوآپریٹو فنانس کارپوریشنز لمیٹڈ'' محکمہ کوآپریٹوز پنجاب'' سے رجسٹر کروائیں اور کوآپریٹوز (محکمہ امداد باہمی) کی روح کے خلاف غیر قانونی طور پر بینکنگ کا کام شروع کر دیا اور 5 نومبر 1991ء تک حکومت پنجاب اور محکمہ کوآپریٹوز کی ملی بھگت سے سادہ لوح عوام سے ''شیئرز'' کے نام پر اور بھاری سود/ منافع کا لالچ دے کر رقم لوٹتی رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے من پسند افراد اور سیاستدانوں کو ناقابل واپسی قرضے بھی دیے جاتے رہے۔ پھر جب ان اداروں نے ان طاقتور سیاستدانوں کو مزید قرض دینے سے انکار کیا تو حکومتی ایوانوں میں بیٹھے عوامی نمائندگان کی رگ حمیت و انصاف پھڑکی اور یہ ادارے راتوں رات غیر قانونی قرار دے کر بند کر دیئے گئے۔

ایک رپورٹ کے مطابق اُس وقت کے وزیراعظم اور وزیر داخلہ پاکستان سمیت بہت سی دیگر اہم شخصیات بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والوں میں شامل تھیں۔ علاوہ ازیں ایک سوسائٹی کے مالک نے ایک بہت بڑے سیاسی گھرانے کے خلاف عام انتخابات میں الیکشن لڑنے کی جسارت بھی کر ڈالی جس کی پاداش میں اس کو اتنا ذلیل وخوار کیا گیا کہ بالآخر اسے موت کی وادی کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کے ناقابل معافی جرم (کسی بڑے سیاسی خاندان کے خلاف الیکشن لڑنا) کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی سزا بھگتنا پڑی۔ باقی تمام اداروں کے ساتھ ساتھ بہت سارے ایسے

دو تین کونسلرز نے بھی سینکڑوں کی تعداد میں مویشی پال رکھے تھے ان کے خلاف کبھی کسی افسر نے کارروائی کرنے کی جرات نہ کی کیونکہ وہ ڈپٹی میئر صاحب کے گروپ کے تھے

Scanned with CamScanner

میں بڑا پرعزم تھا کہ آج بااثر لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انصاف کا بول بالا کروں گا اور اہل علاقہ کو بتاؤں گا کہ قانون کی نظر میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، مجھے کیا پتا تھا کہ میرے اپنے ہی میرے نشیمن پر بجلی گرا دیں گے

ادارے بھی بند کر دیئے گئے جو مالی طور پر انتہائی مستحکم تھے۔ اس مالیاتی سکینڈل میں ایک رپورٹ کے مطابق کل 70 لاکھ خاندان اپنی جمع پونجی سے محروم ہوئے اور لوگوں کے تقریباً سترہ ارب روپے ڈوب گئے۔ چالیس سال گزرنے کے بعد بھی آج تک لوگ اپنے کلیمز حاصل کرنے کے لیئے دھکے کھا رہے ہیں اور ''پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' ابھی تک قائم ودائم ہے۔

ان اداروں کو ایک نوٹیفیکشن کے تحت مورخہ 6 نومبر 1991ء کو بند کیا گیا اور مورخہ 27 فروری، 1993ء کو حکومت نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے ''دی پنجاب ناپسندیدہ کوآپریٹو سوسائٹیز (تنسیخ) ایکٹ، 1993'' جاری کر دیا۔ اس ایکٹ کی رو سے ایک ادارہ ''دی پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن''، تشکیل دیا گیا جس کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ منسوخ کیئے گئے تمام اداروں کی ذمہ داریوں اور اثاثہ جات کا تعین کر دے اور متاثرین کو ان کی جمع شدہ رقوم واپس کرے۔ اس بورڈ میں جوڈیشل افسر کی اسامیاں منظور کی گئیں اور ان افسران کو بورڈ نے یہ اختیارات تفویض کیئے کہ ایک تو وہ ان بند کی گئی سوسائٹیز کے اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کا تعین کریں، ان کے ڈائریکٹرز کے خلاف بھی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے۔ علاوہ ازیں ان اداروں سے قرض لینے والوں کو طلب کر کے مقدمات کی سماعت کی جائے اور فریقین کی سماعت کر کے مقروضان کے ذمہ واجب الادا قرضوں کا تعین کریں اور ان کے خلاف ڈگریاں بھی جاری کریں۔

''دی پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' میں بطور جوڈیشل افسر تعیناتی کے دوران بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جس میں لوگوں نے مجھے دعائیں دی ہوں گی لیکن دو ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے دعاؤں کی قبولیت پر میرا یقین جو پہلے ہی بہت مضبوط تھا وہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ میں ایک دن عدالت میں بیٹھا مقدمات کی سماعت کر رہا تھا۔ وہ دن ایسے مقدمات کے لیے مخصوص تھا جو ناپسندیدہ قرار دی گئی سوسائٹیز کے مالکان/ ڈائریکٹران کے اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کے تعین کے لئے لیکوڈیشن بورڈ نے میری عدالت میں دائر کر رکھے تھے۔

عدالت میں آواز دلائی گئی۔ لیکوڈیشن بورڈ کا نمائندہ پہلے سے عدالت میں موجود تھا۔ صرف ایک ملزم/ مسئول علیہ حاضر ہوا۔ بھاری بھرکم جسم کا پچاس پچپن کے پیٹے کا تقریباً چھ فٹ قد کا شخص عدالت میں پیش ہوا۔ میں نے نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا اور ساتھ ہی کہنے لگا، ''سر مجھے آپ کے قیمتی وقت سے صرف دو منٹ کا وقت چاہیے۔ مجھے آپ کو حقائق بتانے ہیں''۔ میں نے کہا، ''بھائی مجھے یہاں ریاست نے بٹھایا ہی اس لیے ہے کہ میں آپ لوگوں کی باتیں سنوں۔ تمام فریقین کو سن کر کوئی

فیصلہ کروں۔ آپ بات کریں''۔ اس نے اپنی درد بھری کہانی ان الفاظ میں سنائی۔

کہنے لگا: ''سر! میں ضلع جہلم کا رہنے والا ہوں۔ سابقہ فوجی ہوں۔ میں نائیک کے رینک سے پاک فوج سے ریٹائر ہوا ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ایک فوجی اپنی جوانی ہی میں ریٹائر ہو جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کوئی روزگار تلاش کرنا ہوتا ہے۔ میں بھی نئے روزگار کی تلاش میں تھا تو میری کوآپریٹو سوسائٹی کے برانچ منیجر سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے کہا کہ آپ سوسائٹی کے برانچ کے اکاؤنٹ میں کچھ رقم ڈیپازٹ کروائیں اور اپنے عزیز رشتہ داروں کے اکاؤنٹس برانچ میں کھلوائیں آپ کو ہم یہاں پر سیکورٹی انچارج کی نوکری دے دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی جمع پونجی برانچ میں جمع کروادی اور اپنے کچھ رشتہ داروں کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی اپنے پیسے اس برانچ میں جمع کروادیں تاکہ مجھے نوکری مل سکے۔ مجھے نوکری مل گئی۔ میں نے تقریباً چھ ماہ وہاں نوکری کی۔ صرف چار ماہ کی تنخواہ ملی۔ آخری دو ماہ کی نہ ملی اور ادارے راتوں رات بند کر دیئے گئے۔ میری جمع پونجی بھی گئی اور میرے رشتہ داروں کی بھی۔ اوپر سے میرے ساتھ یہ ظلم کیا گیا کہ میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس عدالت میں پیشیاں بھگت رہا ہوں۔ مجھے یہاں آکر یہ پتہ چلا ہے کہ میرا نام سوسائٹی کے ڈائریکٹران کی فہرست میں شامل ہے''۔ یہ کہتے کہتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میں نے اسے تسلی دی کہ وہ اپنی بات مکمل کرے۔ اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔ وہ ذرا سنبھلا اور بولا: ''سر! آپ مقدمہ کی مثل ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس مقدمہ میں میرے علاوہ کوئی اور شخص/ ڈائریکٹر حاضر عدالت نہیں ہو رہا ہے۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ مجھے سیکورٹی انچارج کی نوکری دی گئی تھی۔ مجھے تنخواہ بھی اسی عہدے کی ملتی رہی۔ ریکارڈ آپ کے سامنے ہے۔ جو اصل مالکان ہیں وہ ایک دن بھی آپ کی عدالت میں پیش نہیں ہوئے۔ ان کو ذرہ برابر پروا نہیں۔ میں لاہور آنے کے لیے کرایہ بھی کسی سے مانگ کر آتا ہوں۔ میرے حال پر رحم فرمائیں۔ اگر میرے بطور ڈائریکٹر کسی بھی دستاویز پر کوئی ایک بھی دستخط ریکارڈ میں موجود ہوں تو آپ سوسائٹی کی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دیں میں قبول کرلوں گا۔ آپ سے پہلے والے افسر صاحب سے میں نے بہت دفعہ بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کبھی میری بات نہیں سنی۔ ہر دفعہ میری حاضری لگا کر اگلی تاریخ پیشی دے دی جاتی۔ میں بہت مجبور ہوں۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ میرا اللہ کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ مجھے صرف اور صرف انصاف چاہیے۔ میں بے گناہ ہوں اور غریب بھی۔ جو گناہ گار ہیں اور امیر ہیں وہ تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے عدالت کے بلانے کے باوجود بھی پیش نہیں ہو

مجھے بھی اہلکاروں کی باتیں سن کر ترس آگیا اور ان کی بات سے اتفاق کرلیا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ترس کھا کر کتا چھوڑ دینے پر ایک نیا کتا کھل جائے گا

سی سی او کہنے لگے: "آپ کے خلاف کرپشن کے الزامات ثابت ہو گئے تو؟" میں نے کہا: "سر! اگر میرے خلاف کوئی بھی کرپشن کا الزام ثابت ہو جاتا ہے تو میں اسی وقت نوکری سے استعفے دے دوں گا"

رہے"۔

وہ خاموش ہو گیا تو میں نے لیکوڈیشن بورڈ کے نمائندہ سے پوچھا، "آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟ آپ کا ریکارڈ کیا کہتا ہے؟"۔ اس نے اپنی فائل کھولی اور مجھے ڈائریکٹران کی فہرست دکھائی جس میں مذکورہ مسئول علیہ کا نام موجود تھا"۔ میں نے کہا، "آپ مجھے سوسائٹی کی کسی ایسی میٹنگ کی روداد (منٹس آف میٹنگ) دکھائیں جس میں یہ شخص بحیثیت ڈائریکٹر شامل ہوا ہو اور اس نے دستخط بھی کیے ہوں"۔ نمائندہ بورڈ نے کہا کہ اسے کچھ وقت دیا جائے تاکہ وہ ریکارڈ ڈھونڈ کر عدالت میں پیش کر سکے۔ مسئول علیہ کا بیان لکھ لیا گیا اور حسب استدعا نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کیس کی سماعت آئندہ تاریخ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔ اور نمائندہ بورڈ کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ تاریخ پیشی پر مکمل تیاری کے ساتھ آئے اور متعلقہ مکمل ریکارڈ بھی عدالت میں پیش کرے۔

اگلی تاریخ پیشی پر آواز دلائی گئی۔ مسئول علیہ حاضر عدالت ہوا۔ نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ نے حاضر عدالت ہو کر مزید وقت مانگا کہ ریکارڈ نہیں مل رہا، مصروفیت بھی بہت زیادہ ہے۔ میں نے اسے کہا، "مقدمہ گذشتہ ڈیڑھ سال سے چل رہا ہے۔ آپ ڈیڑھ سال میں ریکارڈ نہیں ڈھونڈ سکے۔ اگر آپ کے پاس ریکارڈ نہیں تھا تو آپ نے یہ مقدمہ عدالت میں کیوں دائر کیا؟ آپ کو آخری موقع دیا جاتا ہے کہ اگر آپ کے پاس اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لیئے کوئی ثبوت ہیں تو پیش کیے جائیں ورنہ عدالت انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دے گی"۔ لہٰذا حسب استدعا نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کو ایک اور التوا دے دیا گیا۔

میں نے اپنے ریڈر کو حکم دیا کہ اگلی تاریخ پیشی سے ایک دن قبل زیر بحث عدالتی فائل میری گاڑی میں رکھوا دے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے رات کو پوری فائل کا تسلی سے معائنہ اور ملاحظہ کیا۔ یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مسئول علیہ کو اگر سوسائٹی کا ڈائریکٹر مان لیا جائے تو اس کی ذاتی ذمہ داری کروڑوں روپے بنتی تھی۔ مزید یہ کہ فائل میں اس کی تعیناتی کے جو احکامات لف تھے وہ سکیورٹی گارڈ کے تھے۔ اس کا نام ابتدائی طور پر ڈائریکٹران کی فہرست میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، لیکن سوسائٹی بند ہونے سے دو ماہ قبل اس کا نام ڈائریکٹران کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا، مزید برآں عدالتی فائل میں کسی بھی جگہ پر مجھے بحیثیت ڈائریکٹر اس کے دستخط نظر نہ آئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی نے آخری مہینے میں ڈائریکٹران کی فہرست میں ردوبدل کیوں کیا؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کوآپریٹو سوسائٹی ایکٹ اور رولز کے مطابق محکمہ کوآپریٹوز نے تمام سوسائٹیز کی وقفوں وقفوں سے تمام رجسٹرڈ سوسائٹیز کے ریکارڈ کی انسپکشن کرنا ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ

Scanned with CamScanner

ان کا آڈٹ بھی۔ لیکن محکمہ کی غفلت، لا پروائی، سستی، بد دیانتی اور بد نیتی کی وجہ سے تقریباً تمام سوسائٹیز کی نہ تو قانون کے مطابق انسپکشن کی گئی اور نہ ہی آڈٹ۔ اس کے در پردہ دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں: ایک تو یہ کہ محکمہ کے لوگوں کی مٹھی گرم ہوتی رہی ہو اور دوسرا یہ کہ ان سوسائٹیز کے مالکان اتنے با اثر اور طاقتور لوگ ہوں کہ محکمہ نہ تو ان کی انسپکشن کر سکتا تھا نہ ہی آڈٹ۔ لیکن محکمہ قانونی طور پر پابند تھا کہ باقاعدگی سے ان سوسائٹیز کا آڈٹ اور انسپکشن کرتا، ایسا نہ کر کے محکمہ کے ملازمین نے بد دیانتی اور مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ ادارے بند ہوئے تو ان اداروں نے اپنے کرتا دھرتا لوگوں کو مالیاتی ذمہ داری سے بچانے کے لیے ان با اثر لوگوں کے نام نکال کر ان لوگوں کے نام بھی ڈائریکٹران کی فہرست میں ڈال دیئے جن کا سوسائٹیز کے معاملات سے دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ اور وہ صرف اور صرف ان اداروں کے ملازمین تھے۔ ایسا ہی معاملہ مذکورہ بالا مسؤل علیہ کے ساتھ ہوا۔

خیر مقررہ تاریخ پیشی پر اور مقررہ وقت پر عدالتی کام شروع ہوا۔ آوازیں دلائی جا رہی تھیں۔ جب مذکورہ بالا مقدمہ کے لیے آواز دلائی گئی تو الزام علیہ/ مسؤل علیہ عدالت میں حاضر ہوا۔ لیکوڈیشن بورڈ کا نمائندہ بھی حاضر عدالت ہوا، میں نے اسے پوچھا،'' آپ اس کیس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا آپ کو کوئی ایسا ریکارڈ ملا جس کی بنا پر آپ نے عدالت میں موجود مسؤل علیہ کو ڈائریکٹر ظاہر کیا اور اس کے خلاف ذمہ داری کے تعین کے لیے آپ نے عدالت ہذا میں مقدمہ دائر کیا؟''۔

کہنے لگا،'' سر! لوگ اتنے ایماندار کہاں رہ گئے ہیں کہ عدالت میں آ کر سچ بولیں۔ آپ کے سامنے جو بھی ڈائریکٹر پیش ہو گا وہی اپنے آپ کو بے گناہ کہے گا۔ اگر ہم سب لوگوں کو بے گناہ سمجھ کر چھوڑتے گئے تو جن لوگوں کی ساری زندگی کی جمع پونجی ان لوگوں نے ہڑپ کی ہے ان کو ہم ادائیگی کہاں سے کریں گے؟۔ سر! اگرچہ عدالت میں موجود مسؤل علیہ کی ڈائریکٹران کی کسی بھی میٹنگ میں حاضری ہمارے ریکارڈ کے مطابق موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دستخطوں سے سوسائٹی کے کوئی اخراجات ہوئے ہیں اور نہ اس نے سوائے تنخواہ کے کوئی اور مالی مفاد سوسائٹی سے حاصل کیا ہے۔ لیکن بمطابق قانون، یہ چونکہ ہمارے ریکارڈ کے مطابق سوسائٹی کا ڈائریکٹر تھا، اس لیے اس کے خلاف ذمہ داری کا تعین کیا جائے تا کہ ہم متاثرین کو رقم واپس دے سکیں۔ سر! ہم سب لوگ لیکوڈیشن بورڈ کے ملازم ہیں، ہم تنخواہ اور دیگر مراعات بورڈ سے ہی تو لے رہے ہیں۔ اگر آپ لیکوڈیشن بورڈ کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں تو بورڈ انتظامیہ سخت ناراض ہو گی''۔

میں نے بڑی حیرت سے اس سے پوچھا،'' آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا اللہ کی ذات بابرکات نے

میں نے کہا:'' میرا دامن اس طرح کی آلودگیوں سے پاک ہے''۔ سی سی او صاحب نے اپنی دراز کھولی اور ایک فائل میرے سامنے رکھ کر کہنے لگے آپ نے لوگوں کا جینا محال کر دیا ہے، آپ کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں کرتے!

میں نے سٹورکیپر سے پوچھا وہ جو دو ہزار روپیہ بھینس کا جرمانہ تھا اس کو خزانہ میں جمع کروادیا ہے؟ کہنے لگا'' سر! یہ تو دو ہزار روپے ہیں، یہاں تو لاکھوں کی رقم ہم اپنے پاس رکھتے ہیں، جب دل چاہتا ہے جمع کروادیتے ہیں''

مجھے اس لئے عدالت میں بٹھایا ہے کہ لیکوڈیشن بورڈ جس کے خلاف بھی کیس فائل کردے میں اس کو بغیر ریکارڈ دیکھے گنہگار قرار دے دوں؟؟ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دوں، آپ کی طرح ظلم کروں، زیادتی کروں، بے گناہ لوگوں کو ذلیل وخوار کروں اور انہیں عدالت کے چکر لگواؤں؟ کیا میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں؟ ہاں! میں اس ہستی کے سامنے جواب دہ ہوں جس کے سامنے تمام ہستیاں ہیچ ہیں۔ میں کسی کے ساتھ ناانصافی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ خواہ مجھے اس کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے، اگر آپ کے پاس اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت ہیں تو پیش کرو، میں آپ کو مزید وقت نہیں دے سکتا نہ ہی مسئول علیہ کو مزید ذلیل کر سکتا ہوں۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ بہت عرصہ ہوتا ہے۔ اس کی ڈیڑھ سالہ اذیت کا حساب کون دے گا؟''۔

کہنے لگا،'' سر! میرے ریکارڈ میں ملزم کے خلاف اور کوئی ثبوت نہیں ہیں، آپ میرٹ پر کیس کا فیصلہ سنا دیں''۔ میں نے فریقین کو آدھ گھنٹے کے بعد دوبارہ آنے کا کہا اور عدالت برخاست کردی۔

آدھے گھنٹہ کے بعد میں دوبارہ عدالت میں بیٹھ گیا۔ اس دوران میں نے فائل پر مختصر فیصلہ لکھ لیا تھا۔ آواز دلانے پر فریقین فیصلہ سننے کے لیے حاضر ہوگئے۔ میں نے فیصلہ پڑھ کر سنایا اور مسئول علیہ کو اس مقدمہ میں تمام تر ذمہ داری سے بالکل بری کر دیا۔ مسئول علیہ کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پوچھنے لگا،'' سر! کیا آپ نے مجھے اس مقدمہ سے بری کر دیا ہے؟'' میں نے کہا،'' ہاں! آپ کو اس مقدمہ سے بری کیا جاتا ہے''۔ میرے یہ الفاظ سنتے ہی وہ چھ فٹ کا صحت مند اور لمبا تڑنگا انسان زاروقطار رونا شروع ہوگیا۔ عدالت کا ماحول افسردگی میں ڈوب گیا۔

عدالت میں موجود دوسرے لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے اور اسکو یقین دلانے لگے کہ اس کو سزا نہیں ہوئی بلکہ بری کر دیا گیا ہے۔ لیکن وہ زاروقطار روئے جا رہا تھا۔ آخر اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں یہ سارا وقوعہ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ عدالت میں موجود لوگوں سے میں نے کہا کہ آپ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں نے اسے بیٹھنے کا کہا لیکن وہ بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نارمل ہوا تو میں نے اس سے پوچھا،'' آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ کو تو مقدمہ سے بری کردیا گیا ہے، آپ کو خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن آپ نے رونا شروع کر دیا۔ اور ہم سب لوگوں کو پریشان کردیا۔ اس رونے کی وجہ کیا ہے؟''۔

کہنے لگا،'' سر! میں رویا اس لئے تھا کہ مجھ پر ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ میں نے اپنے اللہ سے بھی گلے شکوے کرنے شروع کر دیے تھے کہ اے اللہ آپ کو تو پتہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں پھر بھی میری اتنی لمبی آزمائش کیوں؟ میں نے اللہ کی رحمت سے مایوس ہوکر گناہ کیا۔ میں رو رو کر اللہ سے اپنے

گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ دوسرا یہ کہ، سر! مجھے اب بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میرے جیسا شخص جس کے پاس نہ تو کوئی سفارش ہو اور نہ ہی کسی کی خدمت کرنے کے لیے دولت، اس کو کروڑوں روپے کی ذمہ داری سے کیسے بری کیا جا سکتا ہے، سر! آج کے دور میں انصاف کہاں ملتا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاید یہاں بھیجا ہی میرے ساتھ انصاف کرنے کے لئے ہے''۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ پھر دوبارہ بولا اور کہنے لگا: ''سر! میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، میں صرف آپ کو دعا ہی دے سکتا ہوں''۔ پھر اس نے وہاں پر کھڑے کھڑے اپنے ہاتھ اٹھائے اور ان الفاظ میں دعا کی، ''اے اللہ اس سر جی کو زیادہ عرصہ تک اس عدالت میں رکھنا تاکہ میرے جیسے اور بھی لاوارث لوگوں کو انصاف مل سکے''۔ پھر بولا، ''اے اللہ اس سر جی کو اس سے بھی بڑا افسر بنا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو انصاف دے سکیں''۔ عدالت میں موجود سب لوگوں نے اس کی دعا پر آمین کہا اور وہ سلام کر کے عدالت سے چلا گیا۔ وہ دن میری زندگی کا یادگار دن تھا۔ اس رات میں جتنی سکون کی نیند سویا شاید پوری زندگی ایسی نیند نہ سویا ہوں۔، کیوں کہ میں نے ایک بے سہارا اور بے گناہ شخص کو اللہ کی مہربانی سے فوری انصاف فراہم کیا۔ حالانکہ اس طرح کے فیصلے کرنے سے لیکوڈیشن بورڈ کے اعلیٰ افسران میرے ساتھ ناراض بھی ہو سکتے تھے۔ اور مجھے آزمائش میں بھی مبتلا کر سکتے تھے، لیکن فیصلہ چونکہ میرٹ اور نیک نیتی پر مبنی تھا اس لئے لیکوڈیشن بورڈ کے اعلیٰ افسران نے نہ تو مجھ سے کوئی پوچھ گچھ کی اور نہ میرے فیصلے کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں کوئی اپیل دائر کی۔

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ بھی پیش آیا۔ مجھے لیکوڈیشن بورڈ میں کام شروع کیے تقریباً دو ماہ ہی گزرے ہوں گے۔ میں حسب معمول عدالت میں بیٹھ کر مقدمات کی سماعت کر رہا تھا کہ آواز دلانے پر ایک ستر پچھتر سالہ شخص پیش ہوا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ اس نے استدعا کی کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اجازت دی تو کہنے لگا: ''سر! میرا نام (میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ میں نے اپنے سابقہ ریڈر یاسین ملک کو بھی ان کا نام پوچھنے کے لیے فون کیا لیکن وہ بھی ان کا نام بھول چکا ہے)۔ میرے ساتھ سید محمد فاروق ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔ میں سید ہوں، آل رسولؐ ہوں، میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں ہے، آپ جب سے اس سیٹ پر آئے ہیں تب سے ایک حوصلہ سا ہوا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی ایسا افسر بھی آیا جو ہر شخص کی بات تو غور سے سنتا ہے''۔ میں نے انہیں ٹوکا اور کہا'' شاہ صاحب آپ اپنی بات کریں کیوں کہ باقی بہت سارے لوگ عدالت کے باہر موجود ہیں، جن کو ابھی کال کرنا باقی ہے''۔ تو اس

اہلکار نے کہا: میرے ڈپٹی میئر صاحب کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہیں رات کو میں ان کے ڈیرے پر ہی ہوتا ہوں ہم مل کر تاش بھی کھیلتے ہیں

Scanned with CamScanner

اہلکار کا جواب تھا: ''سر! میں ڈپٹی میئر کے خلاف کیسے بیان دے سکتا ہوں، انہوں نے ہی تو مجھے نوکری دلوائی تھی، تو میں ان کے ڈیرے پر روزانہ حاضری دے کر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتا ہوں''

نے اپنی درد بھری کہانی یوں بیان کی: ''سر! میں حبیب بینک لمیٹڈ میں برانچ منیجر تھا۔ اپنی سروس مکمل کرنے کے بعد ریٹائر ہوا۔ اب میری عمر بہتر برس ہے۔ دل کا مریض ہوں۔ میرے گھٹنے بھی جواب دے گئے ہیں، اس لیے میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے بیٹے کو سہارا دینے کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔ گزشتہ دو سال سے آپ کی عدالت کی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر تھک گیا ہوں۔ (میری عدالت دوسری منزل پر تھی) اب مجھ میں سکت نہیں رہی کہ میں سیڑھیاں چڑھ سکوں، میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں جو میرے خلاف مقدمہ بنایا گیا ہے اس پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ کیس طلبی میں چل رہا ہے۔ میرے علاوہ کوئی بھی ملزم پیش نہیں ہو رہا۔ ایک دفعہ سوسائٹی کا مالک حاضر ہوا تھا اس کے بعد وہ مجھے کبھی عدالت میں نظر نہیں آیا۔ آپ عدالتی مثل ملاحظہ فرما کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں آتا ہوں، حاضری لگتی ہے اور آئندہ تاریخ پیشی دے دی جاتی ہے۔ حتی کہ آج تک میرا بیان بھی قلمبند نہیں کیا گیا اور نہ مجھ سے کبھی پوچھا گیا ہے کہ تمہارا مقدمہ میں کیا کردار ہے۔ میں نے یہاں سے تبدیل ہو کر جانے والے افسر صاحب بہادر کو کئی دفعہ اپنی بات سنانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھے کبھی وقت نہ دیا''۔

میں نے شاہ جی سے کہا کہ آپ انتظار کریں، آپ کا بیان آج ہی قلمبند کیا جائیگا۔ روزمرہ کے دوسرے عدالتی امور نمٹا کر جب شہادتیں لکھنے کا مرحلہ آیا تو نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کو طلب کر کے شہادتیں قلمبند کرنا شروع کر دی گئیں۔ شاہ صاحب کی شہادت بھی قلمبند کی گئی۔ انہوں نے اپنا جو بیان قلمبند کروایا اس کا خلاصہ یہ ہے: ''میں حلفاً بیان کرتا ہوں کہ میں حبیب بینک لمیٹڈ کا ریٹائرڈ مینیجر ہوں۔ میں نے اس ادارے/سوسائٹی میں ریٹائرمنٹ کے بعد بحیثیت برانچ مینیجر نوکری جائن کی اور ادارے کی شرائط کے مطابق اپنی پوری جمع پونجی بطور ایڈوانس ڈیپازٹ برانچ میں جمع کروا دی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنا ٹارگٹ پورا کرنے کے لیے اپنے تمام رشتہ داروں، دوستوں اور دیگر جاننے والوں کی رقوم بھی برانچ میں جمع کروائیں۔ بعد میں تمام جمع شدہ رقم ہیڈ آفس ٹرانسفر کر دی گئی۔ میں نے تقریباً چھ ماہ بطور برانچ منیجر کام کیا اور پانچ ماہ کی تنخواہیں وصول کیں۔ پھر حکومت کے حکم سے یہ تمام ادارے بند ہو گئے۔ میری اپنی جمع پونجی اور میرے رشتہ داروں، عزیزوں، دوستوں اور جاننے والوں کی تمام جمع شدہ رقم ڈوب گئی۔ سوسائٹی مالکان روپوش ہو گئے، ہمارا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ جن لوگوں نے برانچ میں رقوم میرے حوالے سے جمع کروائی تھیں ان کے تقاضے شدت اختیار کرتے گئے۔ لیکن میرے پاس تو اب ان کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جب لوگوں کے تقاضوں سے تنگ آ گیا تو میرا جو سمن آباد لاہور میں دس مرلہ کا آبائی مکان تھا اس کو بیچ کر ان

لوگوں کو ادائیگی کر دی۔ اب میں ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ مکان بیچنے کے باوجود لوگوں کو مکمل ادائیگیاں نہیں کر سکا ہوں۔ لوگ اب بھی مجھے بہت پریشان کرتے ہیں لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا جس کو بیچ کر لوگوں کی بقیہ رقم ادا کر سکوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے وہ زیر تعلیم تھا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اب وہ لاہور ہائیکورٹ کے سامنے شاہ بابا بریانی کے نام سے بریانی بیچتا ہے اور ہماری گزر اوقات ہوتی ہے۔ ساری زندگی عزت سے گزاری، اب بڑھاپے میں لوگوں کی باتیں سننا پڑیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ادارے ختم ہونے کے بعد سوسائٹی مالکان نے سابقہ تاریخوں میں کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لیئے میرا نام ڈائریکٹران کی فہرست میں ڈال دیا۔ اب میرے خلاف لیکوڈیشن بورڈ نے بطور ڈائریکٹر ذمہ داری کا تعین کرنے کے لئے دعوی دائر کیا ہوا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ میں کبھی اس ادارے کا ڈائریکٹر نہیں رہا، نہ ہی عدالت ہذا کی طلبی سے قبل یہ بات میرے علم میں تھی۔ جب میں سمن ملنے پر آپ کی عدالت میں آیا تو مجھے پتہ چلا کہ مجھے سوسائٹی والوں نے جعلسازی سے ڈائریکٹر بنا دیا ہوا تھا۔ میں نے کبھی بطور ڈائریکٹر کوئی میٹنگ اٹینڈ کی اور نہ ہی بطور ڈائریکٹر کبھی دستخط کیے۔ اور نہ اس حوالے سے کوئی مالی مفاد سوسائٹی سے حاصل کیا۔ میں ایک لٹا پٹا اور حالات کا مارا ہوا شخص ہوں۔ اس کیس میں بے گناہ ہوں۔ میرے حال پر رحم کھاتے ہوئے مجھے بری کیا جائے“۔

نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کی موجودگی ہی میں بیان لیا گیا تھا۔ بیان ختم ہونے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی اس حوالے سے اپنا مدعا بیان کرے۔ اور اگر مسؤل علیہ سے کوئی سوال کرنا چاہتا ہے تو کر لے۔ اس نے کہا کہ اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اسے تیاری کا وقت دیا جائے، وہ آئندہ تاریخ پیشی پر مکمل ریکارڈ پیش کر دے گا اور اپنا بیان بھی قلمبند کروا دے گا۔ چنانچہ حسب استدعا نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ مقدمہ کی کارروائی آئندہ تاریخ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔ میں آئندہ تاریخ پیشی سے پہلے ہی مثل مقدمہ اپنے گھر لے گیا۔ رات کو تسلی سے اسے ملاحظہ کیا۔ مثل کا ایک ایک ورق چھان مارا۔ ڈائریکٹران کی میٹنگز کی تمام رودادیں (منٹس آف میٹنگز) دیکھ لیے لیکن مجھے اس مثل میں کہیں بھی شاہ صاحب کے بطور ڈائریکٹر دستخط نظر نہ آئے۔ صرف ایک فہرست ڈائریکٹران صفحہ مثل پر موجود تھی جس میں شاہ صاحب کا نام درج تھا اور اس فہرست پر بھی کسی مجاز شخص کے دستخط نہ تھے۔

مقررہ تاریخ پیشی پر آواز دلائی گئی۔ فریقین مقدمہ حاضر ہوئے۔ مثل کے درمیانی احکامات کی شیٹ کو ملاحظہ کیا گیا۔ مثل میں موجود فہرست کو بھی ملاحظہ کیا گیا جس کے مطابق سوسائٹی کے شاید پندرہ

میں اکیلا تھا اور میرے اردگرد عبداللہ بن ابی کے پیروکاروں کا ایک جتھہ تھا، کسی کو کیا بتاتا کہ سروس شروع کرتے ہی مجھ پر دو ہزار روپے رشوت لینے کا الزام لگ گیا ہے

سی سی او صاحب میری باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے، شاید ڈپٹی میئر صاحب سے تعلق کی لاج نبھا رہے تھے۔ کہنے لگے، ''آپ کے پاس دو آپشن ہیں: یا تو ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کر لو یا انکوائری بھگتو''

کے لگ بھگ ڈائریکٹر تھے۔ ان میں سے سوائے شاہ صاحب کے گزشتہ دو سال سے کوئی بھی ڈائریکٹر حاضر نہیں ہو رہا تھا۔ سوسائٹی کا ایک اور ڈائریکٹر صرف ایک دفعہ پیش عدالت ہوا اس کے بعد پھر کبھی نہیں لوٹا۔ کیوں کہ وہ شاید سوسائٹی کا مالک تھا۔ امیر آدمی ہوگا۔ اس کا اثر ورسوخ بھی کافی ہوگا۔ اس کے تعلقات بھی بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ بڑی بڑی سفارشیں، افسروں اور سیاستدانوں کی بھی اس کے پیچھے ہوں گی۔ اور اس کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس افسر/جج کی کتنی قیمت ہے؟ اس کو بھلا کیا ضرورت تھی کہ چھوٹی چھوٹی عدالتوں میں پیش ہوتا پھرے؟ یہ چھوٹی چھوٹی عدالتیں اس کے معیار پر کہاں پوری اترتی تھیں؟ یہ چھوٹی عدالتیں تو غریب، بے بس، مظلوموں اور بے سہارا لوگوں کو بلا کر کھڑا کرنے کے لیے، انتظار کروانے کے لیے، تاریخ پر تاریخ دینے کے لیے اور پھر ان کو پکڑ کر جیل بھیجنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ ان کی کیا مجال کہ کسی طاقتور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔

خیر اگلی پیشی پر نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ نے متعلقہ ریکارڈ پیش کیا۔ ملاحظہ کیا گیا۔ لیکن شاہ صاحب کے بطور ڈائریکٹر کہیں بھی دستخط موجود نہ پائے گئے۔ میں نے نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ سے پوچھا، ''آپ کے پاس اس ملزم/مسؤل علیہ کے خلاف اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لیے اس کے علاوہ کیا ثبوت ہیں؟'' کہنے لگا: ''سر! میرے پاس مسؤل علیہ کے خلاف جو ثبوت تھے پیش عدالت کر دئے ہیں، ان کے علاوہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہیں''۔ میں نے استفسار کیا، ''کیا ڈائریکٹران کی بنائی گئی ایک سادہ فہرست کی بنیاد پر حاضر آمدہ مسؤل علیہ کو ڈائریکٹر سمجھ کر اس کے خلاف ذمہ داری کا تعین کیا جا سکتا ہے؟''۔ تو وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا، بعد میں کہنے لگا، ''سر! آپ میرٹ پر فیصلہ کر دیں۔ اگر لیکوڈیشن بورڈ کو آپ کا فیصلہ سے اختلاف ہوا تو ہم آپ کے فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دیں گے''۔

اس پر میں نے صفحہ مثل پر اپنے ہاتھ سے مختصر فیصلہ لکھا اور مسؤل علیہ (شاہ صاحب) کو سوسائٹی کی تمام تر ذمہ داری سے بری کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ سننے کے بعد شاہ صاحب کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ شاید ان پر وجد طاری ہو گیا تھا۔ وہ ایک جگہ پر گم سم اور ساکت کھڑے تھے اور کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ شاید ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی بغیر رشوت اور سفارش کے انصاف مل جاتا ہے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ میں اس ساری صورتحال کو بڑی دلچسپی اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں شاہ صاحب نے وہاں پر کھڑے کھڑے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور تھوڑی دیر تک زیر لب ہی کچھ پڑھتے رہے۔ پھر بولے اور کہنے لگے، ''سر! میں سید ہوں،

Scanned with CamScanner

آلِ رسولؐ ہوں، آپ نے میرے ساتھ انصاف کیا ہے، میرے پاس سوائے دعا کے آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں نے آپ کے لیے اللہ سے دعا کر دی ہے، آپ یقین کریں میری دعا کبھی رد نہیں ہوئی۔ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ آپ جیسے منصف مزاج افسر کو ڈپٹی کمشنر بنائے''۔

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیے، پھر بولے، ''سر! آج کا دن اور وقت نوٹ کر لیں۔ آپ کو سید نے دعا دے دی ہے، اللہ نے آپ کو ڈپٹی کمشنر بنانا ہے۔ انشاء اللہ، انشاء اللہ'' اور شاہ صاحب اتنی بات کہہ کر اپنے بیٹے سید فاروق شاہ کا سہارا لیتے ہوئے عدالت سے باہر چلے گئے۔ اور میرے سمیت کمرہ عدالت میں موجود تمام لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال گئے۔ اگرچہ میں گومگو کی حالت میں تھا لیکن میرا الیقین کامل عین الیقین میں بدل چکا تھا کہ شاہ صاحب کی دعا ضرور درگاہ رب العالمین میں شرف قبولیت حاصل کرے گی۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ جب میں لیکوڈیشن بورڈ میں بطور جوڈیشل افسر کام کر رہا تھا تو میں ساتھ ساتھ پی سی ایس 1996ء کا مقابلے کا امتحان دوبارہ دینے کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ جب مذکورہ بالا دونوں واقعات پیش آئے اس وقت تک میں نے دوبارہ امتحان نہیں دیا تھا۔ اور اگر میں دوبارہ امتحان نہ دیتا تو میری پرموشن، میرے اس وقت کے محکمہ میں بطور سرکل رجسٹرار، ڈپٹی رجسٹرار اور جائنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائیٹز) ہونا تھی اور میں کسی صورت بھی ڈپٹی کمشنر نہیں بن سکتا تھا۔ اور قبلہ شاہ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں دوبارہ سے پی سی ایس کے مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔ لیکن انہوں نے پھر بھی مجھے ڈپٹی کمشنر بننے کی یقین دہانی کرا دی۔

اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد مذکورہ امتحان کی ڈیٹ شیٹ آ گئی۔ یقین مانیں کہ میں نے جب امتحان دینا شروع کیا تو جب بھی کوئی امتحانی پرچہ حل کر رہا ہوتا تھا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت میری مدد کر رہی ہے۔ مجھے وہ وہ چیزیں بھی یاد آ جاتی تھیں جو میں نے سالوں پہلے پڑھی ہوئی تھیں۔ حالانکہ میں بطور جوڈیشل افسر سرکاری مصروفیات کی زیادتی کے باعث امتحان کی اتنی اچھی تیاری نہیں کر سکا تھا، جتنی کرنی چاہیے تھی۔ امتحان کے اختتام پر میری توقعات یہ تھیں کہ میرا میرٹ زیادہ سے زیادہ سیکشن افسر کا آئے گا کیونکہ اس وقت سیکشن افسر کا میرٹ دوسرے نمبر پر ہوتا تھا اور پہلے نمبر پر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا میرٹ ہوتا تھا جو کہ آج کل کے پی ایم ایس افسر کا ہوتا ہے۔ پھر کیا ہوا؟ ایک معجزہ ہوا!۔

جب میرا پی سی ایس 96 کے مقابلے کے امتحان کا رزلٹ آیا تو اللہ کی مہربانی سے، میرے مرحوم والدین کی دعاؤں سے اور اوپر ذکر کردہ سکیورٹی گارڈ اور شاہ صاحب جیسے بے سہارا اور مجبور

الزام یہ لگا کہ فلاں تاریخ کو شام کے وقت آپ کے زیر استعمال سرکاری جیپ بکر منڈی بند روڈ، لاہور میں موجود پائی گئی اور آپ نے وہاں پر لوگوں سے بھتہ بھی وصول کیا اور اس کی کوئی رسید جاری نہ کی

دراصل ڈپٹی میئر نے سینئر مجسٹریٹ کے ساتھ مل کر چال چلی اور مجھے کرپشن کیس میں پھنسانے کی ناکام کوشش کی۔ میری سرکاری جیپ کو بکرمنڈی لے جایا گیا اور وہاں لوگوں سے دھونس سے رقم وصول کی گئی

لوگوں کی دعاؤں کے سبب میں تحریری امتحان میں پورے صوبہ پنجاب میں فرسٹ آیا اور میرے نمبر 1050/685 تھے۔ (اس وقت تک معروضی سوالات کی لعنت نہیں متعارف ہوئی تھی۔ تمام سوالات انشائیہ طرز کے ہوتے تھے) تاہم مجھے انٹرویو میں سے 200/108 نمبر ملے اور مجموعی طور پر تحریری اور انٹرویو کے نمبر ملا کر صوبہ پنجاب میں میری پانچویں پوزیشن بنی۔

اس سال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صوبہ پنجاب میں صرف دس سیٹیں تھیں۔ پنجاب پبلک سروس کمیشن نے حکومت پنجاب سے مجھے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ فرسٹ کلاس) تعینات کرنے کی سفارش کر دی اور حکومت پنجاب نے مجھے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تعینات کر دیا۔ پھر اللہ کے فضل وکرم سے میں صوبہ پنجاب کے مختلف اضلاع/ ڈویژنز میں بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول)، سپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، ڈپٹی ڈائریکٹر اینٹی کرپشن، ڈپٹی سیکرٹری اور ایڈیشنل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے طور پر کام کر کے باعزت طور اپنی سروس پوری کر کے 2019ء میں ریٹائر ہوا۔

یہ 1998ء کی بات ہے۔ میری اسسٹنٹ کمشنر (پروبیشن) کی ٹریننگ پراونشل سروسز اکیڈمی پشاور سے مکمل ہوئی تو حکومت پنجاب نے مجھے میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں بطور زونل سیکرٹری /سپیشل مجسٹریٹ درجہ اول تعینات کر دیا۔ اس وقت مرکز اور صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت تھی۔ خواجہ احمد حسان، جن کا تعلق بھی مسلم لیگ (ن) سے تھا اس وقت لارڈ میئر میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور تھے اور جناب عرفان الٰہی جو کہ ایک ڈی ایم جی افسر تھے چیف کارپوریشن افسر میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور (ایم سی ایل) تھے۔ میں نے حسب الحکم حکومت پنجاب جب ایم سی ایل میں جائن کیا تو مجھے زونل سیکرٹری/سپیشل مجسٹریٹ، زون نمبر آٹھ لگا دیا گیا۔ اس وقت ایم سی ایل کو آٹھ زونوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ زون نمبر آٹھ کا دفتر سمن آباد لاہور میں تھا اور اس وقت میاں مشتاق احمد ایڈووکیٹ صاحب جن کا تعلق مسلم لیگ (ن) سے تھا، اس زون کے ڈپٹی میئر تھے۔ یہ وہی شخصیت ہیں جن کا ایک بیٹا بعد میں سمن آباد کے علاقہ ہی سے مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر ایم این اے بھی بنا۔

میں نے زون نمبر آٹھ میں جائن کیا تو پتہ چلا کہ اس زون میں زونل سیکرٹری کے لئے کوئی دفتر سرے ہی موجود نہیں۔ زونل سیکرٹری کے دفتر میں جناب ڈپٹی میئر صاحب نے اپنا دفتر بنا لیا ہوا تھا۔ میں اس سلسلہ میں جناب ڈپٹی میئر صاحب سے ملا اور ان سے پوچھا کہ میرا دفتر کون سا ہوگا اور میں کہاں بیٹھ کر کار سرکار سرانجام دیا کروں گا؟ تو فرمانے لگے: ”آپ میرے پاس ہی بیٹھ جایا کریں، علیحدہ دفتر کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے عرض کی، ”سر! آپ

کا دفتر ایک سیاسی دفتر ہے۔ یہاں تو سارا دن لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا، میں یہاں بیٹھ کر کیسے کام کر پاؤں گا؟'' میری اس جرات رندانہ پر جناب ڈپٹی میئر صاحب نے کافی ناگواری کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کچھ کرتا ہوں۔ میں چونکہ نیا نیا مجسٹریٹ بنا تھا، پروٹوکول ملنے کے بڑے بڑے خواب تھے لیکن یہاں تو معاملہ یکسر ہی الٹ نکلا۔ مجھے سارے خواب چکنا چور ہوتے نظر آئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک پی سی ایس افسر بن کر ان حالات سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن میں چونکہ ایک بے سہارا افسر تھا، میری پشت پر نہ تو کوئی سیاستدان تھا اور نہ کوئی بیوروکریٹ، اس لیے ایسی جگہ سے تبادلہ کروانا بھی میرے بس میں نہ تھا، اس لیے مجھے حالات سے سمجھوتہ کر کے انہی حالات میں کار سرکار سرانجام دینے تھے۔ تاہم بعد میں انہوں نے کمال مہربانی کی اور ایک چھوٹا سا دفتر مجھے الاٹ کر دیا۔ اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھی اس میں رکھوا دیا۔

یہاں میں بتاتا چلوں کہ ہمارے بیوروکریٹک سسٹم میں ایک لاوارث افسر کے لیے کیا کیا مسائل ہوتے ہیں۔ اسے نہ تو اچھی پوسٹنگ ملتی ہے اور نہ کسی مشکل میں پھنس جانے کی صورت میں اس کی مدد کو کوئی آتا ہے، ہاں کچھ لوگ سروس میں آ کر چاپلوسی، جی حضوری، اور کچھ دیگر تکنیکی داؤ پیچ سیکھ کر افسران بالا کے منظور نظر بن کر افسری کے مزے لوٹتے ہیں۔ اپنی مرضی کی پوسٹنگ لیتے ہیں۔ خود بھی انجوائے کرتے ہیں اور اپنے سرپرستوں کو بھی انجوائے کرواتے ہیں۔ اپنے عہدے سے دو دو گریڈ سینئر سیٹوں پر دھڑلے سے براجمان ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان سے سینئر افسران کو ان کی ماتحتی میں کام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمارے ملک کے سیاستدانوں کے پاس جب اختیارات آتے ہیں تو وہ اپنے اختیارات کا کس طرح ناجائز استعمال کرتے ہیں اور اگر کوئی خوددار افسران کی ہر بات من وعن تسلیم نہ کرے تو اسے نیچا دکھانے کے لیے اس کے خلاف کتنے گھٹیا حربے استعمال کرتے ہیں اور اس کو اتنا زچ کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ ان سے صلح کر لیتا ہے اور اپنی انا اور خودداری کا سودا کر کے ناانصافیوں پر مبنی فیصلے کر کے ان کو خوش کر کے اپنی عاقبت خراب کر لیتا ہے۔

ہمارے ملک کے افسران بالا کا بھی ؛ چند استثنائی صورتوں کے علاوہ، ایک المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے خلاف آنیوالی ہر شکایت کو صحیح سمجھ بیٹھتے ہیں اور پس پردہ حقائق سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس سرکاری ملازم کے خلاف ایک منفی تصور بنا لیتے ہیں جس کے خلاف ایک سادہ کاغذ پر درخواست آ جاتی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو بندہ صحیح کام کرے گا، کسی کی سفارش نہیں مانے گا، ناجائز کام نہیں کرے گا، لوگوں سے پیسے لے کر ان کے حسب منشا کام نہیں کرے گا، تو کیا سیاستدان یا غلط کام کرنے اور کروانے والے مافیاز اس کی

ہر نئے الیکشن کی آمد پر افسران کی وہ اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے کہ الامان، الحفیظ، خواہ مخواہ ہی افسران کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیج کر ٹی اے/ ڈی اے کی مد میں ریاست کو کروڑوں روپے کا ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

سیاست دانوں کی توقعات ہمارے اپنے ہی افسراس حد تک بڑھا دیتے ہیں جن پر پورا اترنا ہر افسر کے بس کی بات نہیں اور پھر ایسے سیاستدان ہر اس افسر کا جینا حرام کر دیتے ہیں جو میرٹ کا نام لیتا ہو

تعریف کریں گے، ہرگز نہیں، وہ تو اس کی شکایات ہی کریں گے، اس کے خلاف جھوٹے الزامات بھی لگائیں گے، اس کو انکوائریوں میں الجھائیں گے، اپنا کام نکالیں گے اور اپنی دھاک بٹھائیں گے تاکہ بعد میں آنے والا افسر محتاط رہے اور میرٹ پر کام کرنے کی جرأت نہ کرے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ سرکاری ملازم کے خلاف آنے والی ہر شکایت/درخواست جھوٹی ہی ہوتی ہے بلکہ بہت سی شکایات حقیقت پر بھی مبنی ہوتی ہیں۔ ایسی شکایات پر بعداز انکوائری الزامات ثابت ہونے کی صورت میں سرکاری ملازمین کے خلاف سخت ترین ایکشن لیا جانا چاہیے۔

میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری ملازمت کی خواہش رکھنے والے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ پاکستان میں سرکاری ملازمت ان لوگوں کے لیے ہرگز پھولوں کی سیج نہیں جو میرٹ پر کام کرنا چاہتے ہیں اور انہیں یہ بھی پتہ چلے کہ ایمانداری سے، میرٹ کی بنیاد پر، بغیر سیاسی مداخلت کو مانے، انصاف کی فراہمی اور خودداری سے کام کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور ایسے سرکاری ملازم کو کس طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اسے کس طرح گلی کا پتھر بنا دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک سال کے اندر اندر کتنی جگہوں پر تبادلہ کیا جاتا ہے یا اس کو کتنا عرصہ افسر بکار خاص (او ایس ڈی) رکھا جاتا ہے۔

خیر، دفتر ملنے کے بعد میں نے سٹاف کی میٹنگ کال کی۔ سب لوگوں سے فرداً فرداً تعارف کے بعد میں نے سینئر لوگوں سے پوچھا کہ میرے فرائض میں کیا کیا شامل ہوگا۔ انہوں نے دیگر کاموں کے علاوہ دو کاموں کے بارے میں بتایا کہ وہ کام ان دنوں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے ایک کام ناجائز تجاوزات ہٹانا تھا اور دوسرا کام لاہور شہر سے مویشیوں کے انخلاء کا تھا۔ یعنی مجھے اپنے تفویض شدہ علاقہ کو مویشیوں سے پاک کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ہر زون کو ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ پولیس کی نفری بھی دی جاتی ہے جس کی مدد سے انخلائے مویشیاں کا کام کیا جاتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ سب سے زیادہ تجاوزات کس علاقہ میں ہیں تاکہ ہم وہاں سے کام کی بسم اللہ کریں۔ انہوں نے بتایا کہ چوک یتیم خانہ میں انتہا درجہ کی تجاوزات ہیں جس کی وجہ سے وہاں پر عام طور پر ٹریفک کے بہاؤ میں رکاوٹ رہتی ہے، اس کے علاوہ اچھرہ بازار اور کچھ دیگر جگہوں کے نام بھی بتائے گئے۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ ہم تجاوزات ہٹانے کا کام چوک یتیم خانہ سے شروع کریں۔ ان میں سے مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ زون کے ڈپٹی میئر صاحب کی رہائش بھی چوک یتیم خانہ میں ہے اور ان کے زیادہ تر ووٹر اور سپورٹر اسی علاقہ سے ہیں۔

یہ ایک اور المیہ ہے کہ عام طور پر ماتحت ملازمین ہر نئے آنیوالے آفیسر کو پہلے تو مسائل میں الجھاتے ہیں پھر اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اور

اس افسر کے قریب ہونے کے لئے بظاہر افسر کا ساتھ دیتے ہیں لیکن درپردہ وہ اپنے سیاسی آقاؤں کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ لوکل گورنمنٹ کے اداروں میں تو یہ وبا عام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لوکل گورنمنٹ کے زیادہ تر ملازمین کو مقامی سیاستدانوں نے ہی بھرتی کروایا ہوتا ہے اور ایسے ملازمین جب تک سروس میں رہتے ہیں ان کا مطمع نظر صرف اور صرف اپنے سیاسی آقاؤں کی وفاداری کرنا اور ان کی خوشنودی قائم رکھنا ہوتی ہے، کیونکہ افسران تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ان کے سیاسی آقا تو تادم مرگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ان لوگوں نے ایسے ہی کیا۔ چنانچہ دوران میٹنگ یہ فیصلہ ہوا کہ اگلے دن ناجائز تجاوزات کے خلاف مہم کا آغاز چوک یتیم خانہ، لاہور سے ہوگا۔

اگلے دن حسب پروگرام تہہ بازاری عملہ زون نمبر آٹھ کے ہمراہ چوک یتیم خانہ سے عارضی تجاوزات ہٹانے کا کام شروع ہوا تو وہاں کی یونین کے لوگوں نے سرکاری ملازمین کو تجاوزات ہٹانے سے روکا۔ لیکن میں نے ہمت کرکے ان کے دو لوگوں کو موقع پر گرفتار کرلیا اور متعلقہ تھانہ سے فون کرکے نفری منگوا لی۔ جب نفری آئی تو میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گرفتار شدہ ملزمان کو متعلقہ تھانہ کی حوالات میں بند کرنے کے لیے ہمراہ ہی پولیس ملازمین کو روانہ کردیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ باقی لوگ موقع سے فرار ہوگئے اور ہم نے تسلی کے ساتھ سامان تجاوزات اٹھا کر ٹرکوں میں ڈال کر دفتر کے سٹور میں جمع کروادیا۔ جب میں مع اپنی ٹیم وہاں سے روانہ ہوا تو وہ چوک یتیم خانہ جہاں ہر وقت ٹریفک بلاک رہتی تھی پہچانا نہ جا رہا تھا۔ ٹریفک رواں دواں تھی، کوئی رکاوٹ نہ تھی اور لوگ ہمیں دعائیں دے رہے تھے کہ عرصہ دراز کے بعد اس چوک میں بھی تجاوزات کے خلاف آپریشن ہوا اور لوگوں کو سکون ملا۔ تاہم دوسری طرف ناجائز تجاوز کنندگان ہمیں برا بھلا بھی کہہ رہے تھے، دھمکیاں بھی دے رہے تھے۔ اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے کانوں سے ان لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نیا نیا افسر آیا ہے، اپنا وزن اور ریٹ بڑھا رہا ہے، منتھلی لینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ منتھلی شروع ہو جائے گی تو اسے یہ تجازات نظر آنی بند ہو جائیں گی، وغیرہ، وغیرہ۔ میں عملے کے ہمراہ وہاں سے نکلا، راستے میں ایک جگہ گاڑی کھڑی کی۔ گرفتار شدہ ملزمان کے خلاف اپنے ہاتھوں سے استغاثہ لکھا، اپنے دستخط کئے اور مقدمہ کی ایف آئی آر درج کرنے کی غرض سے مذکورہ استغاثہ پولیس ملازمین کے حوالے کرکے دفتر اور پھر دفتر سے گھر روانہ ہوگیا۔

میرے پاس ان دنوں موبائل فون تو تھا، لیکن میرا نمبر سوائے سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے، کسی کے پاس نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں بہت کم لوگوں کے پاس موبائل فون ہوتا

جب آپ کسی سیاسی شخصیت کے کندھے پر بیٹھ کر کوئی بھی سرکاری عہدہ حاصل کریں گے اور اس طرح کی ناپائیدار عارضی بیساکھیاں استعمال کریں گے تو ایسے سیاستدان آپ کو اپنا زرخرید غلام نہیں سمجھیں گے تو اور کیا سمجھیں گے!

محکمہ مال جیسے اہم محکمہ کو بھی ضلعی حکومتوں کا حصہ بناتے ہوئے اس ملک کا اتنا نقصان کیا گیا جو شاید ہی کبھی پورا ہو سکے

تھا، کیونکہ اس دور میں موبائل فون رکھنا ایک سٹیٹس سمبل سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں موبائل کی کال سننے والے کو بھی شاید چھ روپے فی منٹ کے حساب سے بل دینا پڑتا تھا۔ اس لیے میں اپنا موبائل فون چھپا کر رکھتا تھا تاکہ بل زیادہ نہ آئے۔ میں راستے میں ہی تھا کہ جناب سی سی او صاحب کا فون آ گیا۔ مجھے جناب ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد کا نمبر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ میں ان سے بات کروں۔ میں نے گھر پہنچ کر ڈپٹی میئر صاحب کو فون کیا تو وہ سخت غصہ میں تھے۔ کہنے لگے،'' آپ کو نہیں پتہ کہ زون کا انچارج ڈپٹی میئر ہوتا ہے؟ آپ نے میری اجازت کے بغیر چوک یتیم خانہ میں کیسے ریڈ کی؟ آپ کو نہیں پتہ کہ میرا گھر بھی ادھر ہے اور میرا حلقہ انتخاب بھی یہی علاقہ ہے؟ کل صبح آپ نے سیدھا میرے دفتر آنا ہے، پھر بات ہوگی۔ سر دست تھانہ میں فون کرو اور جو معززین آپ نے گرفتار کئے ہیں ان کو وہاں سے رہائی دلواؤ، میں نے بڑی کوشش کی ہے لیکن ایس ایچ او تھانہ آپ کی اجازت کے بغیر ان کو نہیں چھوڑ رہا''۔

میں نے عرض کی،'' سر! مجھے معلوم ہے کہ آپ زون کے سیاسی انچارج ہیں لیکن میں تو حکومت کا نمائندہ ہوں۔ آپ کے اپنے اختیارات ہیں اور میرے اپنے۔ اگر ہر کام کرنے کی آپ سے اجازت لوں گا تو کام کیسے چلے گا۔ کیونکہ آپ کی اپنی سیاسی مجبوریاں ہوں گی۔ باقی رہا گرفتار شدہ ملزمان کو رہائی دلانا، وہ اب میرے بس میں نہیں ہے کیونکہ میں ان کے خلاف استغاثہ دستخط کر کے تھانہ میں بھیج چکا ہوں۔ دوسرا سر! اگر ایسے معززین کو چھوڑ دیا جائے تو میں اس زون میں کام کیسے کر سکوں گا، کیونکہ ان لوگوں نے موقع پر انتہا درجے کی بدمعاشی دکھائی۔ مجھے اور میرے سٹاف کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور کار سرکار میں مداخلت کی۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں ان کو نہیں چھڑوا سکتا'' میری یہ بات سن کر ڈپٹی میئر صاحب نے فون بند کر دیا۔

میں اگلے دن صبح دفتر پہنچا تو سٹور کیپر میرے پاس آیا اور بتایا۔'' سر! کل ہم نے ناجائز تجاوزات کنندگان کا چوک یتیم خانہ سے جتنا بھی سامان اٹھایا تھا وہ سارا سامان شام کو ڈپٹی میئر صاحب نے مجھے ان لوگوں کو واپس کرنے کا حکم دیا تو میں نے ان لوگوں کو سارا سامان واپس کر دیا ہے''۔ میں نے پوچھا:'' یہ بتاؤ کہ ناجائز تجاوزات کا اٹھایا ہوا سامان واپس کرنے کا اختیار کس کا ہے؟'' تو کہنے لگا'' سر! وہ اختیار تو آپ کا ہے''۔ پھر میں نے اسے پوچھا: '' تم نے ڈپٹی میئر کے کہنے پر سامان کیوں واپس کیا؟'' کہنے لگا،'' سر! ہم چھوٹے ملازمین ہیں، ہم نے ان لوگوں کے ساتھ نوکری کرنا ہوتی ہے، میں ڈپٹی میئر صاحب کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ سر! میں تو بے سہارا سا آدمی ہوں، ڈپٹی میئر صاحب کی حکم عدولی کرنے کی جرات نہیں کر سکتا''۔ مجھے اس کی یہ

Scanned with CamScanner

بات سن کر بہت حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میں نے اسے کہا،'' تمہارے خلاف انضباطی کارروائی ہو گی۔ جس کے لئے آج ہی میں مجاز اتھارٹی کو تحریر کروں گا۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی کہ تم نے میری اجازت کے بغیر لوگوں کو سامان واپس کر دیا''۔ لیکن وہ میری یہ بات سن کر قطعاً پریشان نہ ہوا شاید اس کو معلوم تھا کہ ان کے اپنے ڈپٹی میئر کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کا کوئی افسر بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

میں غصے سے تلملا رہا تھا، اسی حالت میں ڈپٹی میئر کے آفس گیا۔ سلام کر کے بیٹھ گیا۔ ڈپٹی میئر صاحب بھی بہت غصے میں تھے۔ سٹور مین سے میری جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی میرے پہنچنے سے پہلے ان تک پہنچ چکی تھیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے،'' آپ نے کل جن معززین اور شرفاء کے خلاف مقدمہ درج کروایا تھا ان کو کون سی سزائے موت ہو جانی ہے، آج نہیں تو کل وہ ضمانت پر رہا ہو کر گھر آ جائیں گے۔ بہت دکھ ہوا کہ میں نے ذاتی طور پر ان لوگوں کو چھڑوانے کی درخواست کی لیکن آپ نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ یقین کریں میری اتنی توہین پوری زندگی میں نہیں ہوئی جتنی کل ہوئی۔ آپ نے میرے پلے کچھ نہیں چھوڑا''۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر بولے،'' ایک تو کل آپ نے میری اجازت کے بغیر چوک یتیم خانہ میں ناجائز تجاوزکنندگان کے خلاف کارروائی کی، دوسرا اگر میں نے ان لوگوں کا سامان واپس کیا تو آپ نے سٹور کیپر کے خلاف انضباتی کارروائی کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ آپ نے اگر اس زون میں نوکری کرنی ہے تو یہاں پر جو میں چاہوں گا وہی ہو گا۔ اور خبردار اگر سٹور کیپر کے خلاف کوئی کارروئی کی۔ اگر کارروائی کرنی ہے تو میرے خلاف کرو۔ اس نے بات ختم کی تو میں نے عرض کی'' سر! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ زون کے ڈپٹی میئر ہیں، اور سیاسی لیڈر بھی ہیں، لیکن مجھے میرے سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا کہ میں نے ہر کام آپ سے پوچھ کر کرنا ہے، آپ ان سے بات کر لیں''۔ کہنے لگے،'' میں کیوں سی سی او سے کہوں؟ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ اس زون میں وہ ہو گا جو میں کہوں گا''۔ میں پھر کچھ نہ بولا اور انہیں سلام کر کے اپنے آفس آ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں جب بھی کوئی نیا نیا افسر بنتا ہے تو وہ یہ ارمان اور خواہشات لے کر آتا ہے کہ اس نے جو بھی کام کرنا ہے میرٹ پر کرنا ہے۔ لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے۔ لوگوں کا خادم بن کر ان کی خدمت کرنی ہے۔ عوام کے لیے زحمت نہیں رحمت ثابت ہونا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ اکیلا ہی تبدیلی لے آئے گا۔ ملک میں شہد کی نہریں بہا دے گا۔ اسے ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس راہ میں تو کانٹے ہی کانٹے ہیں۔

میں بھی کچھ اسی طرح کے احساسات وجذبات

مشرف دور میں تعمیر وترقی کے کام بہت زیادہ ہوئے لیکن اس کی وجہ ناظمین کی حکمت عملی اور جانفشانی نہ تھی بلکہ فنڈز کی فراوانی تھی

میں سوچنے لگا کہ انسان کتنا ظالم ہے، یہ اپنی موت کیوں بھول جاتا ہے اس کو یاد کیوں نہیں رہتا کہ آج وہ کسی کی وراثت ہڑپ کر رہا ہے اور کل کو اس کی اپنی بھی وراثت تقسیم ہونی ہے اور وہ خالی ہاتھ دنیا سے جائے گا

لے کر بیوروکریسی میں آیا تھا۔ اس گلے سڑے اور متعفن نظام کو درست کرنے نکلا تھا۔ ابتدا سے لے کر ریٹائرمنٹ تک پوری سروس اس گئے گزرے نظام کے خلاف جہاد کرتے گزر گئی۔ بہت سی مشکلیں، آزمائشیں اور پریشانیاں بھی آئیں لیکن اللہ نے مجھے ثابت قدمی سے اپنا کام جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اگرچہ میں کوئی بڑی تبدیلی نہ لا سکا نہ کوئی اکیلا شخص یہ کام کر سکتا ہے۔ میں نے آتش نمرود کو بجھانے کے لیے آنیوالے ننھے سے پرندے کی طرح اپنے حصے کا کام جاری رکھا۔ اور اپنے ضمیر کے مطابق فیصلے بھی کرتا رہا۔ میں نے پوری سروس اپنے حصے سے بھی زیادہ کام کر کے اس نظام کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ ضرور ڈالا۔ کیوں کہ یہ میرے فرائض میں شامل تھا کہ میں اپنے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ اختیارات اس کے بندوں کی فلاح و بہبود، آسائش، آسانی۔ بہتری اور انہیں انصاف کی فراہمی کے لئے استعمال کروں۔ میں نے اپنے کیریئر کے دوران افسر شاہی اور سیاستدانوں کے گٹھ جوڑ، کرپشن اور دیگر مفادات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیاستدانوں کو کرپشن تک لانے میں افسر شاہی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سیاستدانوں کو کرپشن کے راستے یہی لوگ دکھاتے ہیں کہ کہاں سے مال کیسے کمایا جا سکتا ہے۔

جب افسران اچھی اچھی سیٹیں لینے کے لیے سیاستدانوں کے ڈیروں کو رونق بخشیں گے، ان کی چاپلوسی کریں گے۔ ان کی مالش اور پالش جیسا فریضہ سرانجام دیں گے، ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ناانصافیاں کریں گے۔ ان کا ہر جائز و ناجائز کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر ان کو اس کی رپورٹ کرنا سعادت اور ثواب کا کام سمجھیں گے۔ تو پھر انہیں میرے جیسے افسران کیوں پسند ہوں گے؟ ہمارے ڈپٹی میئر صاحب کا دماغ خراب کرنے والے بھی ہمارے اپنے ہی افسران تھے۔ ورنہ موصوف پڑھے لکھے شخص تھے۔ سیاستدانوں کا دماغ خراب کرنے کے حوالے سے میں یہاں پر اپنی سروس کے دوران پیش آنے والے صرف دو واقعات بڑے اختصار کے ساتھ بیان کروں گا جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے کچھ افسران کس حد تک گری ہوئی حرکتیں کر کے اپنی نوکریاں پکی کرتے اور انصاف پسند افسران کے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

پچھلی سطور میں بیان کئے گئے واقعہ کے بعد میری ڈپٹی میئر صاحب سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ ڈپٹی میئر صاحب کا نائب قاصد میرے پاس آیا اور پیغام دیا کہ ڈپٹی میئر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ میں ان کے آفس گیا تو وہاں پر زون کے ایک سینئر سپیشل مجسٹریٹ تشریف فرما تھے۔ وہ ریونیو سروس سے تھے۔ میں ان کا نام نہیں لینا

Scanned with CamScanner

چاہتا۔ موصوف کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی جس میں لوگوں کو کیے گیے جرمانوں کی تفصیل تھی۔ وہ ڈپٹی میئر صاحب کو وہ فہرست دکھا رہے تھے اور ساتھ یہ بھی بتا رہے تھے کہ سر یہ وہ شخص ہے جس کی آپ نے سفارش کی تھی اس کو میں نے صرف ایک سو روپیہ جرمانہ کیا ہے۔ دوسرا یہ والا تھا جس کی آپ نے سفارش کی تھی اس کو آپ کے حکم کی تعمیل میں صرف دو صد روپیہ جرمانہ کیا ہے۔ ہاں سر یہ وہ والا بدمعاش ہے جس کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا کہ اس کو ”فل ڈوز“ دینی ہے۔ سر! میں نے اس کو پورے پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ڈپٹی میئر صاحب آپ سے بہت ناراض ہیں۔ اور ہاں سر! وہ یہ بھی کہہ رہا تھا آپ میری ڈپٹی میئر صاحب سے ملاقات کروا دیں۔ آپ سر، جب حکم کریں گے میں اس کو آپ کے ڈیرے پر لے آؤں گا۔ ڈپٹی میئر صاحب بہت خوش ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے میری اضطرابی کیفیت سے محظوظ بھی ہو رہے تھے۔

جب ڈپٹی میئر صاحب ساری رپورٹ دیکھ چکے تو معزز مجسٹریٹ صاحب کہنے لگے، ”سر! کل کے لیے کیا حکم ہے؟“ ڈپٹی میئر صاحب گویا ہوئے، ”آپ اپنے ساتھی کو بھی کچھ سمجھائیں“۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ”سینئر سپیشل مجسٹریٹ صاحب ان سے سیکھیں کہ نوکری کیسے کرتے ہیں؟ آپ کی نوکری کی شروعات ہیں لیکن آپ کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح اپنی سارا دن کی کارروائی کی آ کر رپورٹ مجھے دیتے ہیں؟“ میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ کچھ نہ بولا۔ اتنے میں سینئر مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی میئر صاحب سے پوچھا: ”سر! کیا ہوا ہے؟ کیا کر دیا ہے چودھری صاحب نے؟ یہ تو بڑا سخت مقابلے کا امتحان پاس کر کے مجسٹریٹ بنے ہیں۔ ان کی یہاں پوسٹنگ کو تو ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں“۔ ڈپٹی میئر صاحب کہنے لگے: ”انہوں نے آتے ہی میری سیاست کا بھٹہ بٹھا دیا ہے۔ پھر انہوں نے ایک ہی سانس میں پچھلے دنوں کی ساری کارروائی سنا دی۔ یہ ساری باتیں سن کر سینئر مجسٹریٹ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے: ”چودھری صاحب! آپ میرے بچوں کی طرح ہیں۔ ڈپٹی میئر صاحب تو بڑی پڑھی لکھی اور مہربان شخصیت ہیں۔ ان کے ساتھ آپ نے زیادتی کی ہے۔ آپ کو ان سے معافی مانگنی چاہیے۔ یہ ہمارے بڑے ہیں۔ ہمیں ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہیے“۔

یہ بات سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا، ”سر! زیادتی میں نے کی ہے یا ڈپٹی میئر صاحب نے؟ میں نے کون سا غلط کام کیا ہے؟ میں نے ڈپٹی میئر صاحب کے اختیارات میں کون سی مداخلت کی ہے۔ انہوں نے ہی میرے اختیارات میں مداخلت کی ہے۔ میں ناجائز تجاوزات کا سامان اٹھا کر لایا۔

سٹوڈنٹ کہنے لگا: ”سر! ہم یتیم اور بے سہارا بچے ہیں، ہمیں انصاف کون دے گا، آپ ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہیں
ہم دعاؤں کے علاوہ آپ کو کیا دے سکتے ہیں!

Scanned with CamScanner

جب افسران اپنی نوکری بچانے کے چکروں میں سیاستدانوں کے غلط اور ناجائز کام کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر اس طرح کی ڈیمانڈز کا آنا ایک فطرتی عمل تھا

انہوں نے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے از خود وہ سامان لوگوں کو غیر قانونی طور پر واپس کر دیا۔ اب آپ بتائیں کہ زیادتی کس نے کی؟ اور معافی کس کو مانگنی چاہیے۔'' یہ باتیں سن کر سینئر مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی میئر صاحب کی طرف دیکھا۔ میں نے بھی ڈپٹی میئر صاحب کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان کی آنکھوں سے شرمندگی سی عیاں تھی۔ لیکن زبان سے اپنی غلطی اور غیر قانونی حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس پر سینئر مجسٹریٹ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے، ''چودھری صاحب پچھلی باتوں پر مٹی ڈالیں۔ آئندہ ہم سب مل کر کام کریں گے''۔ دوسرے لفظوں میں سینئر مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی میئر صاحب کا ساتھ دیتے ہوئے یک طرفہ اور بد نیتی پر فیصلہ سناتے ہوئے انہیں باعزت بری کر دیا۔ کیوں کہ ان میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کو وہ حق سچ کا ساتھ دیتے۔ ان کو کم از کم ایک دفعہ تو ڈپٹی میئر صاحب کو احساس دلانا چاہئے تھا کہ انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ لیکن وہ میرے لیے کیوں اپنی نوکری خراب کرتے۔ اپنی نوکری خراب کرتے بھی کیسے! وہ ریاست کے ملازم تھوڑے تھے، وہ تو ڈپٹی میئر صاحب کے ذاتی ملازم بنے ہوئے تھے۔

پھر ڈپٹی میئر صاحب سینئر مجسٹریٹ صاحب بہادر سے فرمانے لگے، ''یار یہ شیزان والوں کا بڑا دماغ خراب ہے۔ (مشہور زمانہ شیزان فیکٹری بند روڈ پر واقع تھی اور زون نمبر آٹھ کی حدود میں تھی) ان کا کوئی بندوبست کرو۔ میری طرف متوجہ ہو کر: ''کل آپ بھی ان کے ساتھ جائیں گے تا کہ آپ کو بھی تجربہ حاصل ہو''۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان دنوں لاہور کے شہری علاقوں سے مویشیوں کی شہر بدری کی مہم زوروں پر تھی اور اس کے لیے ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ ہر زون کو سپیشل پولیس فورس بھی ملتی تھی۔ اس سلسلہ میں ٹاؤن ہال سے ایک شیڈول بھی جاری ہوتا تھا۔ شیڈول کے مطابق میرے زون میں ایک دن بعد سپیشل پولیس فورس مہیا کی جاتی تھی۔ میں نے پھر سٹاف کی میٹنگ کال کی۔ متعلقہ سینئر ملازم سے پوچھا کہ مویشیوں کے انخلا کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی جاتی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم لوگ ایک دن پہلے خفیہ سروے کرتے ہیں، جس علاقہ میں مویشیوں کی موجودگی کا علم ہو جائے اگلے دن وہاں ریڈ کر کے مویشی پکڑ لیے جاتے ہیں اور ان کو ایم سی ایل کے کانجی ہاؤسز میں بند کر دیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان کا چارہ وغیرہ کہاں سے آتا ہے تو جواب ملا، ''سر! سنا ہے کہ پہلے تو چارے کے لیے ہر زون کو بجٹ ملا کرتا تھا لیکن کافی عرصہ ہو گیا ہے اس حوالے سے کوئی بجٹ زونز کو نہیں دیا جاتا۔ اب سر! مویشی مالکان اپنے بند شدہ مویشیان کے لیے خود ہی چارے کا بندوبست کرتے ہیں''۔

میں نے پھر پوچھا کہ بند شدہ مویشیوں کو حوالہ

Scanned with CamScanner

مالکان کرنے کے لیے کیا طریقہ کا ہے؟ تو اس شخص نے مجھے بتایا، ”سر! یہاں پر اس سلسلہ میں دو طریقے رائج ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ مویشی مالکان ایم سی ایل کی طرف سے مقرر کردہ جرمانہ۔ مبلغ دو ہزار روپیہ فی بڑا جانور اور مبلغ ایک ہزار روپیہ فی چھوٹا جانور۔ خزانہ سرکار میں جمع کروا کر اپنے اپنے مویشی واپس لے جاتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مویشی مالکان لاہور ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کرتے ہیں۔ وہاں سے ہائی کورٹ کا ایک حکم نامہ لے کر واپس آتے ہیں جس میں تحریر ہوتا ہے کہ مویشی مالکان سے مبلغ پانچ صد روپیہ فی بڑی شاخ اور مبلغ دو صد پچاس روپیہ فی چھوٹی شاخ وصول کر کے مویشیوں کو حوالہ اصل مالکان کر دیا جائے۔ ہم مذکورہ جرمانہ وصول کر کے مویشیان حوالہ اصل مالکان کر دیتے ہیں“۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ کل کہاں ریڈ کرنی ہے؟۔ تو کہنے لگا، ”جہاں آپ حکم کریں گے“۔ میں نے کہا، ”بھائی میں تو یہاں نیا آیا ہوں آپ لوگوں کو سب پتہ ہوگا کن کن علاقوں میں کون کون سے لوگوں نے شہری حدود میں مویشی پال رکھے ہیں۔ آپ خود ہی مجھے تجویز دیں“۔ متعلقہ ملازم کہنے لگا، ”سر! ہم آج سروے کر لیتے ہیں۔ کل صبح ریڈ کر کے مویشی پکڑوا دیں گے“۔ وہ تو مجھے کافی دیر بعد پتہ چلا کہ یہ لوگ صرف ان لوگوں کے مویشی پکڑواتے ہیں جو ان کو منتھلی نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں کے مویشی بار بار اس وقت تک پکڑواتے رہتے ہیں جب تک کہ یہ لوگ مجبور ہو کر منتھلی دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں اور جن کی طرف سے منتھلی آتی ہے ان کو بروقت ریڈ کی اطلاع کر دیتے ہیں۔ ایسے مویشی مالکان اپنے مویشیوں کو بروقت کہیں اور لے جاتے ہیں اور ریڈ ناکام ہو جاتی ہے۔ میں نے اس شخص سے سوال کیا کہ وہ اس زون میں کب سے ہے؟ اس نے بتایا اس کو زون نمبر آٹھ میں پوسٹ ہوئے تقریباً تین سال ہو گئے ہیں۔ تو میں نے پھر اس سے پوچھا کہ کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس تین سال کے عرصہ کے دوران زون میں مویشی رکھنے والے تمام لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی ہے؟ کہنے لگا: ”سر! ایسا تو ممکن نہیں ہے۔ سیاسی دور ہے۔ اس زون میں دو تین کونسلرز نے بھی سینکڑوں کی تعداد میں مویشی پال رکھے ہیں۔ ان کے خلاف کبھی کسی افسر نے کارروائی کرنے کی جرات نہیں کی۔ کیوں کہ وہ جناب ڈپٹی میئر صاحب کے گروپ کے ہیں۔ حکومتی پارٹی کے ہیں۔ جناب ڈپٹی میئر صاحب نے بھی ان کے خلاف کارروائی کرنے سے منع کر رکھا ہے“۔ میں نے اسے کہا، ”بھئی! یہ تو نا انصافی نہیں ہے؟۔ کیا ایک منصف مزاج افسر کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ بے سہارا لوگوں کے خلاف تو بھاگ بھاگ کر قانونی کارروائی کرتا پھرے اور طاقتور لوگوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں موند لے؟ مجھ سے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یا تو یہ کام کروں گا ہی نہیں۔

اصل حقیقت سامنے آئی کہ متوفی کے تین بچے تھے وہ لاولد نہیں تھا اور محکمہ مال کے افسران نے بچوں کے ساتھ زیادتی کی ہے اور ان کا وراثتی رقبہ غیر قانونی طور پر دیگر افراد کے نام منتقل کر دیا ہے

ضلع ناظم نے مجھے کہا: ''آپ ایک اسسٹنٹ کمشنر ہوکر بھی اتنی جرات کے مالک ہیں کہ ان کے خلاف فیصلہ دے دیا، آپ کا شاید اس ضلع میں نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، اب آپ کی خیر نہیں''

اگر کروں گا تو قانون شکنی کرنے والے تمام لوگوں کے خلاف کارروائی کروں گا''۔

وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑا رکا اور پھر کہنے لگا، ''سر! میں نے آپ کو اصل صورتحال سے آگاہ کر دیا ہے۔ آپ جو بھی حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ میں تو پھر آپ سے یہ عرض کروں گا جس طرح سے پہلے کام چل رہا ہے آپ بھی ویسے ہی چلائیں۔۔ سر! ان سیاستدانوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ یہ اپنے مفادات کے لیے سارے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ جب ایمانداری سے اور میرٹ پر کام کرنے والے کسی افسر پر کوئی مشکل آتی ہے تو اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے سر پر جو بھی آفت آتی ہے وہ خود ہی اور اکیلا ہی بھگتتا ہے۔ اس کے ساتھ انصاف کرنے والا کوئی نہیں ہوتا''۔

میں نے کہا، ''کوئی بات نہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ اور ایمان ہے جو انصاف کرتا ہے اللہ کی ذات بھی اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیتی۔ اس کو سرخرو کرتی ہے''۔ پھر میں نے اسے کہا، ''آپ یوں کریں کہ آج رات کو آپ مجھے وہ سارے باڑے دکھا دیں جن کے خلاف کبھی قانونی کارروائی نہیں ہوئی۔ ہم کل ان کے خلاف کارروائی کریں گے۔ لیکن یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو''۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ بولا، ''سر! ساری جگہوں کا تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ ہمارا ایک گینگ مین ہے۔ کافی لمبے عرصے سے اس زون میں ہے۔ میں اس کو بلا لوں گا۔ اس کو تمام جگہوں کا پتہ ہوگا۔ وہ ہمیں مکمل ریکی کروا دے گا''۔ خیر، میں طے شدہ پروگرام کے مطابق شام کو علاقہ میں گیا۔ یہ دو ملازم اور میرا سرکاری ڈرائیور میرے ساتھ تھا۔ انہوں نے مجھے پوری ریکی کروادی۔ میں نے ان دونوں سے پھر کہا: ''بھائی اس راز کو راز ہی رکھنا۔ کل صبح ہم ان بااثر لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کریں گے۔ ان کے مویشیوں کو پکڑ کر کانجی ہاؤس میں بند کریں گے''۔ انہوں نے بڑی اونچی آواز سے انشااللہ کہا۔

اگلے دن علی الصبح پولیس فورس بھی پہنچ گئی۔ پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور کوئی بیس کے لگ بھگ ماتحت اہلکاران شامل تھے۔ پولیس کی ایک بس بھی تھی جس میں سارے پولیس والے سوار ہوکر آئے تھے۔ یہ میری سروس کی ''انخلائے مویشیاں'' کی پہلی مہم تھی۔ میں بڑا پرعزم تھا کہ آج بااثر لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انصاف کا بول بالا کروں گا اور اہل علاقہ کو بتاؤں گا کہ قانون کی نظر میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میرے اپنے ہی میرے نشیمن پر بجلی گرا دیں گے۔

ہم مع پولیس دفتر سے روانہ ہوئے۔ کارپوریشن کا پورا عملہ ساتھ تھا۔ پہلے موقع پر پہنچے تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ اس باڑے میں ایک بھی مویشی نہیں تھا بلکہ وہ باڑا اتنی احتیاط سے صاف کیا گیا تھا

کہ لگتا تھا کہ وہاں کوئی مویشی کبھی قریب بھی نہیں پھٹکا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جس میں ایک دن پہلے شام کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گیا تھا۔ میں نے اپنی پریشانی کا کسی کو احساس نہ ہونے دیا۔ سوچا کہ دوسری جگہ چلتے ہیں۔ وہاں ہماری ریڈ کامیاب ہو جائے گی۔ تمام لوگوں کو لے کر دوسری جگہ پہنچا۔ وہاں کا حال بھی پہلے والی جگہ سے مختلف نہ تھا۔ مکمل صفائی ستھرائی۔ مویشیوں کا نام ونشان نہ تھا۔ کسی مہربان نے اپنے مہربانوں کو بروقت اطلاع دے کر ان کی عزت بچالی تھی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی اور پریشانی بھی۔ میں نے تیسری جگہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس دفتر کی راہ لی۔ اس دن میں کوئی مویشی نہ پکڑ سکا لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ جب تک میں اس زون میں تعینات رہا ان نام نہاد بااثر لوگوں کو اپنے گھروں میں مویشی رکھنے کی جرات نہ ہوئی۔

واپسی پر ہم لوگ ایک گلی سے گزر رہے تھے تو کیا دیکھا کہ کسی نے اس گلی میں ہی ایک عدد بھینس اور اس کا کٹا باندھ رکھا ہے۔ چونکہ ہم نکلے ہی انخلائے مویشیاں کی مہم پر تھے اس لیے یہ تو مناسب نہیں تھا کہ مویشی دیکھے بھی جائیں اور ان کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے حکم پر اس بھینس اور کٹے کو قبضہ میں لے لیا گیا۔ میں نے سٹاف کو حکم دیا کہ ان مویشیان کو کانجی ہاؤس میں بند کر کے دفتر واپس آ جائیں۔ میں دفتر میں جا کر بیٹھا سوچ رہا تھا ''مخبری'' کرنے والا گھٹیا ملازم کون ہو سکتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ، اس کا بلایا گیا گینگ مین یا میرا سرکاری ڈرائیور؟ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ میرے کمرے میں بعداز اجازت داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ میرے ساتھ ان دونوں نے ریڈ کی ناکامی کا افسوس کیا۔ میں نے کہا: ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، سیانے کہتے ہیں کہ مارنے سے ڈرانا بہتر ہے۔ میرا مقصد صرف مویشیوں کو پکڑنا نہیں، انہیں شہری حدود سے باہر نکالنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں''۔

اب میرے خلاف سیاسی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں اہلکار کہنے لگے'' سر! آپ سے ایک گزارش کرنی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ ہم بڑے مان سے آپ کے پاس آئے ہیں''۔ میں نے کہا بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کہنے لگے:'' سر! آپ چونکہ نئے نئے آئے ہیں۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم آپ کو گائیڈ کریں۔ آپ ہمارے باس ہیں۔ آپ کی عزت ہماری عزت ہے''۔ میں نے انہیں ٹوکا اور کہا،'' آج تو آپ نے میری بڑی ''عزت افزائی'' کی ہے۔'' کہنے لگے،'' سر ہم خود بھی بہت پریشان ہیں۔ پہلے اس زون میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم ڈھونڈ رہے ہیں کہ یہ بے غیرتی کس

پی اے نے ناظم صاحب کا یہ پیغام بھی دیا کہ اے سی سے پوچھو کہ
''ایہہ کیہڑا چودھری اے سنن وچہ آیا اے کہ ایہہ ارائیں اے تے اتھاں
آ کے وت چودھری بناودا اے اتھاں ارائیاں نوں کائی پچھدا ناہیں''

میں نے پی اے سے کہا کہ ناظم صاحب کو بتا دے کہ
"ہاں میں ارائیں آں پر میں ضلع قصور دا ارائیں آں
تے ساڈے ضلعے وچ صرف ارائیں ای چودھری نیں

نے کی ہے، آپ تھوڑا سا وقت دیں ہم وہ غدار ڈھونڈ کر آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ میں نے کہا اصل مدعا بیان کرو۔ سپرنٹنڈنٹ کہنے لگا،" سر! دراصل جو دو عدد جانور ہم نے واپسی پر پکڑے ہیں وہ اس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے قریبی عزیزوں کے ہیں۔ غریب لوگ ہیں۔ اس بھینس کے علاوہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ یہ بے چارے اسی بھینس کا دودھ بیچ کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ مہربانی فرمائیں اور ان جانوروں کو بغیر جرمانہ لیے چھوڑ دیں"۔ میں نے کہا بھائی یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بغیر جرمانہ لئے مویشی چھوڑ دوں۔ کیا یہ غیر قانونی نہیں ہوگا؟ کہنے لگا۔" سر! مویشیوں کا مالک بہت ہی غریب آدمی ہے، اس میں جرمانہ مبلغ تین ہزار ادا کرنے کی سکت نہیں۔ اس کے پاس صرف دو ہزار روپے ہیں۔ اگر آپ حکم کریں تو ہم ایک بھینس کا جرمانہ مبلغ دو ہزار روپے لے لیں اور کٹا بغیر جرمانے کے چھوڑ دیں"۔ مجھے بھی ان کی باتیں سن کر ترس آ گیا اور ان کی اس بات سے اتفاق کرلیا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ترس کھا کر کٹا چھوڑ دینے پر ایک نیا کٹا کھل جائے گا۔

تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مجھے عرفان الٰہی، سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کا فون آ گیا اور حکم دیا کہ کل صبح دفتر جانے سے پہلے میرے دفتر میں آئیں۔ میں نے کہا،" سر ٹھیک ہے۔ حکم کی تعمیل ہوگی"۔ مجھے ایم سی ایل میں تعینات ہوئے تقریباً ایک ماہ ہی گزرا ہوگا۔ سی سی او صاحب سے زیادہ علیک سلیک نہ تھی۔ اس طرح بلانے کی وجہ کیا ہے؟۔ میں ان سے نہ پوچھ سکا۔ دل و دماغ میں طرح طرح کے خیال آتے رہے۔ بالآخر رات جیسے تیسے گزر ہی گئی اور میں اگلے دن دیئے گئے وقت پر جناب سی سی او صاحب کے دفتر واقع ٹاؤن ہال، لاہور جا پہنچا۔ سی سی او صاحب اپنے دفتر میں موجود تھے۔ ان سے اجازت لے کر ان کے دفتر میں داخل ہوا اور ان کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت کچھ فائلیں دیکھ رہے تھے۔ فارغ ہوئے تو میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد کہنے لگے،" کیسا کام چل رہا ہے زون میں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟"۔ میں نے عرض کی:" سر! کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنا کام ٹھیک طریقے سے کر رہا ہوں۔ نیا نیا آیا ہوں۔ کام سیکھ رہا ہوں"۔ مجھے اس طرح مطمئن دیکھ کر حیرانی سے کہنے لگے" آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟ ڈپٹی میئر صاحب تو آپ کی بہت شکایات کرتے رہتے ہیں"۔ میں نے کہا:" سر! وہ بزرگ آدمی ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کیوں شکایت ہے مجھ سے؟ مجھے تو ان سے کوئی شکائت نہیں"۔ دراصل میں شروع دن سے ہی اس بات کا قائل تھا کہ افسران بالا کو خواہ مخواہ شکایات کرنے والا افسر نا اہل ہوتا ہے۔ اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اچھا منتظم وہ

ہوتا ہے جو اپنے سینئر کو کم سے کم امتحان میں ڈالے۔ کم سے کم شکایات کرے۔ تمام پیش آمدہ مسائل کا خود حل تلاش کرے۔ اسی وجہ سے میں نے جناب سی سی او صاحب سے جناب ڈپٹی میئر صاحب کی کوئی شکایت نہ کی۔ مجھے اپنے آپ پر یقین تھا کہ مجھ میں اللہ کی مہربانی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ میں حالات پر قابو پالوں گا۔

سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے پہلے تو میری طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہنے لگے ''آپ کو یہاں آئے ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا، لیکن آپ کی کرپشن کی شکایات آنا شروع ہوگئی ہیں''۔ میں ان کی یہ بات سن کر بہت حیران ہوا۔ ان سے کہا، ''سر ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے قطعاً کوئی کرپشن نہ کی ہے اور ہی نہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہے''۔ کہنے لگے، ''میرے پاس ثبوت ہیں۔ اگر آپ کے خلاف کرپشن کے الزامات ثابت ہوگئے تو؟'' میں بڑا ہی مطمئن تھا۔ ان کی طرف سے یہ چیلنج سن کر میرے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ جذباتی ہوگیا۔ میں نے کہا: ''سر! اگر میرے خلاف کوئی بھی کرپشن کا الزام ثابت ہو جاتا ہے تو میں اسی وقت نوکری سے استعفےٰ دے دوں گا''۔

سی سی او صاحب میری اس دیدہ دلیری پر بہت حیران اور پریشان ہوئے۔ پہلے تو مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا، پھر کہنے لگے ''آپ کو پتہ ہے کہ آپ کتنی بڑی بات کر رہے ہو۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ سی ایس ایس یا پی سی ایس کا امتحان پاس کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور آپ اتنا بڑا دعوی کر رہے ہیں''۔ میں نے کہا ''سر! آپ درست فرما رہے ہیں۔ واقعی میں بڑے سخت ترین امتحانات سے گزر کر ہی پی سی ایس افسر بنا ہوں لیکن میں جو دعوی کر رہا ہوں نہایت سوچ سمجھ کر بقائمی ہوش و حواس کر رہا ہوں۔ میں نے کوئی کرپشن نہیں کی۔ میرا دامن اللہ کے فضل و کرم سے اس طرح کی تمام آلودگیوں سے پاک ہے''۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ جناب سی سی او صاحب نے اپنی دراز کھولی اور ایک فائل میرے سامنے رکھ کر کہنے لگے، ''اس درخواست میں دیکھو کیا لکھا ہوا ہے؟''۔ میں نے فائل کھولی۔ اسے پڑھا۔ درخواست/ شکایت کے مندرجات کچھ اس طرح تھے:

''جناب (چیف کارپوریشن افسر) میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور۔ جناب عالی! گزارش ہے کہ ہم معزز شہری ہیں اور علاقہ زون نمبر آٹھ میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔ اس زون میں آپ نے ایک افسر عبدالغفور چودھری نام کا تعینات کیا ہوا ہے۔ اس نے لوگوں کا جینا محال کر دیا ہے۔ کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں کرتا۔ لوگوں کا سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور پیسے لے کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی کوئی رسید جاری نہیں کرتا۔ لوگوں کے مویشی بھی پکڑ کر لے جاتا

میں پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا کہ ہم کس معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں لوگ یتیموں کا مال بھی ہڑپ کر جاتے ہیں اور ان کو اپنے اس فعل پر ذرا بھی شرمندگی نہیں ہوتی

اپنی نوکری کی فکر لاحق ہوئی کہ اتنے طاقتور ضلع ناظم کو ناراض کر کے ان کے ضلع میں کیسے گزارہ ہوگا، جہاں پر تمام افسران صرف اور صرف ضلع ناظم کی خوشنودی کے لیے کام کر رہے ہوں

ہے۔ جرمانہ وصول کرتا ہے لیکن اس کی بھی رسید جاری نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں اس نے چوک یتیم خانہ میں ریڈ کی۔ ناجائز تجاوز کنندگان کا دو ٹرک سامان اٹھایا اور بعد میں سارا سامان لوگوں سے پیسے لے کر واپس کر دیا اور کسی بھی شخص کو کوئی رسید جاری نہ کی۔ اس کے علاوہ دو تین دن پہلے سمن آباد کے علاقہ سے ایک عدد بھینس اور ایک عدد کٹا پکڑا۔ مالک انتہائی غریب آدمی تھا۔ اس سے مبلغ دو ہزار روپیہ جرمانہ لے کر مویشی چھوڑ دیئے اور کوئی سرکاری رسید نہ جاری کی گئی۔ استدعا کی جاتی ہے کہ اس افسر کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے اور زون نمبر آٹھ کے لوگوں کی اس سے جان چھڑوائی جائے۔ العارض۔ اہل علاقہ زون نمبر آٹھ۔ میٹروپولیٹن کارپوریشن، لاہور۔''

سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) بظاہر تو کام میں مشغول ہو گئے لیکن وہ میرے چہرے کے تاثرات کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جب پوری درخواست پڑھ لی تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''سر! یہ سب کچھ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو قابل گرفت ہو۔ میں نے چوک یتیم خانہ سے سامان ضرور اٹھایا تھا اور ساتھ ہی دو یونین اہلکاران کے خلاف مقدمہ بھی درج کروایا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈپٹی میئر صاحب میرے ساتھ سخت ناراض بھی ہوئے تھے۔ اور وہ سارا سامان ڈپٹی میئر صاحب نے ہی لوگوں کو دیا تھا اور میں نے کسی شخص کو کوئی جرمانہ نہیں کیا تھا۔ باقی رہا مویشیوں کا معاملہ تو سر! میں نے ایک بھینس اور ایک کٹا پکڑا تھا۔ ان کا مالک میرے دفتر کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کا رشتہ دار تھا۔ مجھے اس نے ہی گزارش کی تھی کہ ان جانوروں کا مالک بڑا غریب آدمی ہے۔ کٹے کا جرمانہ نہ لیا جائے۔ میں نے ان کی درخواست پر مبلغ دو ہزار جرمانہ وصول کر کے جانوروں کو چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ رسید سٹور کیپر نے جاری کرنی تھی۔ اس نے یقیناً جاری کر دی ہوگی''۔

اس پر سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے پھر سے مجھے پوچھا کہ آپ نے جو استعفا والی پھڑ ماری ہے اس پر ابھی تک قائم ہیں؟'' میں نے جواب دیا، جی سر! میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں''۔ سی سی او صاحب نے پھر پوچھا "جب ڈپٹی میئر صاحب نے لوگوں کو سامان واپس کرنے والا غیر قانونی کام کیا تو آپ نے اس کی تحریری یا زبانی رپورٹ کسی کو کی؟ اور دوسرا آپ نے رسید بک چیک کی تھی؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگے، ''سمندر میں رہ کر اگر مگرمچھ سے بیر رکھنا ہو تو پھر آنکھیں اور کان کھول کر چلنا پڑتا ہے۔ ماتحتوں پر اندھا اعتماد نہیں کرتے اور اس طرح کے غیر قانونی معاملات (ڈپٹی میئر والے) کی تحریری رپورٹ اپنے افسران بالا کو کر دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ اس درخواست کے پیچھے کس کا ہاتھ

ہے۔ میں یہ انکوائری ریاض احمد ریاض، جو یہاں پر سینئر مجسٹریٹ ہیں کو مارک کر رہا ہوں۔ آپ ان کے پاس جا کر اپنی بے گناہی ثابت کریں اور سنو اتنے بڑے بڑے دعوے نہیں کرتے اور ہاں محتاط رہنا۔ آئندہ آپ کی اس طرح کی کوئی شکایت نہ آئے''۔ میں انہیں سلام کر کے ان کے دفتر سے نکلا اور اپنے دفتر آ گیا۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے سٹور کیپر کو مع رسید بک بلایا۔ وہ حاضر ہوا۔ میں نے پوچھا کہ رسید بک کیوں نہیں لے کر آئے؟ کہنے لگا، ''سر! رسید بک تو جناب ڈپٹی میئر صاحب نے کافی دن پہلے منگوالی تھی۔ میں کافی دفعہ ان کے پاس رسید بک لینے گیا ہوں لیکن وہ ٹال دیتے ہیں''۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ جو دو ہزار روپیہ بھینس کا جرمانہ تھا اس کو خزانہ سرکار میں جمع کروادیا ہے کہ نہیں؟ کہنے لگا سر وہ تو میں نے جمع نہیں کروائے۔ وہ تو میرے پاس ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ تم نے کیوں نہیں جمع کروائے؟ یہ تو سیدھی خرد برد ہے۔ تمہارے خلاف قانونی کارروائی بھی ہوسکتی ہے۔ کہنے لگا، ''سر! رسید بک تو ڈپٹی میئر صاحب کے پاس تھی۔ وہ مجھے دے نہیں رہے تھے۔ میں رسید کاٹتا تو رقم خزانہ سرکار میں جمع کرواتا۔'' میں نے اسے کہا کہ خزانہ سرکار میں رقم جمع کروانے کے لیے رسید کا کاٹا ہونا ضروری تو نہیں۔ تم رقم بینک میں جمع کروادیتے اور رسید بعد میں کاٹ لیتے۔ کہنے لگا، ''سر! یہ تو دو ہزار روپے ہیں۔ یہاں پر تو لاکھوں کی رقم ہم اپنے پاس رکھتے ہیں۔ جب دل چاہتا ہے بینک میں جمع کروادیتے ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟'' میں نے کہا بھائی یہ تو غیر قانونی حرکت ہے۔ اس طرح سرکار کے پیسے اپنے پاس رکھنے سے سرکاری ملازم ضابطے کے تحت خرد برد کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ تم نے تو اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ تم ابھی جاؤ اور ڈپٹی میئر صاحب سے رسید بک واپس لے کر آؤ۔'' وہ تھوڑی دیر بعد واپس آیا پھر کہنے لگا ''سر! ڈپٹی میئر صاحب نے رسید بک دینے سے انکار کر دیا ہے اور ساتھ مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ کے سیکرٹری / مجسٹریٹ صاحب کے خلاف ایک شکایت سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے پاس آئی ہوئی ہے جس میں بھینس والے دو ہزار روپے کا ذکر ہے جس کی نہ تو ابھی تک کوئی رسید کٹی ہے اور نہ ہی وہ رقم خزانہ سرکار میں جمع ہوئی ہے''۔

میں نے اس اہلکار سے کہا اس جرم کی کارروائی تو آپ کے خلاف بنتی ہے۔ میں نے تو درخواست پر حکم جاری کیا تھا کہ سائل سے مبلغ دو ہزار روپیہ جرمانہ وصول کر کے بھینس حوالہ اصل مالک کی جائے۔ رسید تو آپ نے کاٹنا تھی اور جرمانہ بھی خزانہ سرکار میں جمع کروانے کی ذمہ داری آپ کی تھی''۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ کہنے لگا، ''سر! آپ پریشان نہ ہوں میں ڈپٹی میئر صاحب سے بات کرتا ہوں۔ میرے ان کے

میں نے یہ بزدلانہ لیکن دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ اس ضلع سے فوراً تبادلہ کروالیا جائے کیوں کہ مجھے اس اسٹیشن پر آئے ہوئے پونے تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا، اور اگر تین ماہ کا عرصہ پورا ہو جاتا تو وہاں سے سالانہ خفیہ رپورٹ لکھوانا لازمی ہو جاتا

میں نے سائل سے صرف اتنا کہا کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا کیونکہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان اچھی طرح یاد ہے کہ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والا شخص بہت بڑے اجر کا مستحق ہے

ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ رات کو میں ان کے ڈیرے پر ہی ہوتا ہوں۔ ہم مل کر تاش بھی کھیلتے ہیں۔ ابھی تو نہیں بات نہیں کر سکتا۔ ان کے پاس کافی لوگ بیٹھے ہیں۔ میں شام کو ان سے بات کر لوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) سے بھی بات کر لیں گے۔ وہ سی سی او صاحب کے بڑے اچھے دوست ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مذکورہ درخواست پر آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی''۔

میں حیرانی سے اس کا منہ تک رہا تھا کہ وہ کس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے سختی سے کہا ''ڈپٹی میئر صاحب سے میری سفارش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سارے معاملے میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر قصور ہے تو آپ کا ہے۔ میں انکوائری کا سامنا کر لوں گا لیکن تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ (کیونکہ سٹور کیپر کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کا اختیار سی سی او صاحب کے پاس تھا)۔ یہ سب کچھ تمہاری اور ڈپٹی میئر کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔ اگر ڈپٹی میئر صاحب نے رسید بک منگوائی تھی تو تم نے پہلے کیوں نہ مجھے بتایا؟۔ ڈپٹی میئر کا رسید بک سے کیا تعلق ہے؟ کب منگوائی تھی انہوں نے رسید بک؟'' کہنے لگا: سر! جس دن آپ نے بھینس کا جرمانہ کیا تھا انہوں نے اسی دن مجھ سے رسید بک لے لی تھی اور مجھے رسید کاٹنے سے منع بھی کر دیا تھا''۔

میں نے اس سے پوچھا، ''کیا یہ سارا بیان تم انکوائری افسر کے سامنے دے سکتے ہو؟''۔ کہنے لگا، ''سر! میں ڈپٹی میئر کے خلاف کیسے بیان دے سکتا ہوں، انہوں نے ہی تو مجھے نوکری دلوائی تھی، اسی لیے تو میں ان کے ڈیرے پر روزانہ حاضری دے کر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتا ہوں۔ سر! جو بات میں نے آپ کو بتائی ہے اگر آپ کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی کریں گے تو میں صاف مکر جاؤں گا۔ کبھی ڈپٹی میئر صاحب کے خلاف بیان نہیں دوں گا''۔

پھر کہنے لگا، ''سر! آپ میرے افسر ہیں۔ مہربان ہیں۔ نئے نئے افسر بنے ہیں۔ آپ کا تجربہ بہت کم ہے لیکن سر! اگر آپ حکم کریں تو میں آپ کی ایک مدد کر سکتا ہوں۔ آپ کی ساری پریشانی دور ہو جائے گی اور آپ زون میں حکمرانی کے مزے لوٹیں گے''۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگا ''سر! میں آپ کی ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کروا دیتا ہوں۔ وہ میری کسی بھی بات کو نہیں ٹالتے۔ سینئر سپیشل مجسٹریٹ صاحب کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ اس زون میں کس طرح انجوائے کر رہے ہیں؟''۔

سٹور کیپر کی باتیں سن کر میں حقیقت میں پریشان ہو گیا کہ جناب ڈپٹی میئر صاحب انتقام میں اندھے ہو کر کس حد تک گر گئے ہیں؟ وہ کس طرح کے گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں؟ ان کے پاس ایسی گھٹیا حرکت کا کیا اخلاقی جواز ہے؟ ان کو ذرہ بھر احساس نہیں ہے کہ وہ ایک کیریر افسر کے خلاف ایسی

گھٹیا حرکات صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ میرٹ کی بات کرتا ہے۔ جو نہ تو خود کسی کے اختیارات میں تجاوز کرتا ہے اور نہ دوسروں کی اپنے اختیارات میں مداخلت قبول کرتا ہے۔میں نے سٹور کیپر کو سختی سے منع کر دیا کہ میرے حوالے سے ڈپٹی میئر صاحب سے کوئی بات نہ کرے۔کیوں کہ میں حق پر تھا۔اور مجھے یقین کامل تھا کہ اللہ کی ذات حق پرستوں کا ساتھ دیتی ہے۔

پھر خیال آیا کہ آرڈر شیٹ جس پر میں نے جرمانہ کیا تھا میری صفائی اور بے گناہی ثابت کرنے کے لئے وہی کافی ہے۔میں انکوائری افسر کے سامنے اسے پیش کروں گا تو مجھے بری کر دیا جائے گا۔کیونکہ افسر کے ذمہ حکم نامہ جاری کرنا ہوتا ہے۔ جرمانہ وصول کر کے اسے خزانہ سرکار میں جمع کروانا متعلقہ اہل کار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔سٹور کیپر کو حکم دیا گیا کہ وہ درخواست سائل اور آرڈر شیٹ پیش کرے۔لیکن سٹور کیپر کہنے لگا کہ سر! وہ بھی ڈپٹی میئر صاحب کے پاس ہے۔میں نے اسے کہا کہ جائے اور ان سے وہ دستاویزات لے کر آئے۔وہ گیا اور حسب معمول خالی ہاتھ واپس آ گیا۔اور متوقع طور پر اس کا وہی جواب تھا کہ ڈپٹی میئر صاحب وہ دستاویزات نہیں دے رہے۔

ساتھ ہی ان کا پیغام بھی دیا کہ اگر آپ کو کوئی چیز چاہیے تو ان سے بات کر لیں۔یعنی یہ سارا چکر صرف اور صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے چلایا جا رہا تھا۔مجھے ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کرنے پر مجبور کرنے کے لیے یہ سارا تانا بانا بنا جا رہا تھا۔میرا ڈپٹی میئر صاحب سے کوئی جھگڑا تو تھا ہی نہیں۔بات صرف اصول کی تھی۔وہ میرے اختیارات غیر قانونی طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔میں سروس میں نیا نیا آیا تھا۔پریشان ہو گیا۔میں نے تو کبھی ایسا تصور بھی نہ کیا تھا۔میرا دماغ ماؤف ہونے کے قریب تھا۔ میں اکیلا تھا اور میرے ارد گرد عبداللہ بن ابی کے پیروکاروں کا ایک جتھہ تھا۔کسی کو کیا بتاؤں کہ سروس شروع کرتے ہی مجھ پر دو ہزار روپے رشوت لینے کا الزام لگ گیا ہے۔اسی پریشانی کے عالم میں اللہ کو پکارا۔دعا مانگی، اے غیب کا علم جاننے والے۔میں آزمائشوں کے قابل نہیں ہوں۔مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔میری غیب سے مدد فرما۔

اچانک دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ سی سی او صاحب سے مل کر تمام حقائق ان کے گوش گزار کیے جائیں۔دفتری فون اٹھایا۔ٹیلیفون آپریٹر سے کہا کہ وہ میری سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) سے بات کروائے۔تھوڑی دیر میں ہی میری بات ہو گئی۔میں نے سی سی او صاحب سے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔پوچھنے لگے، ''خیریت تو ہے۔کوئی نیا چن تو نہیں چڑھا دیا زون میں؟'' ان کے اس رویے سے مجھے تشویش تو بہت ہوئی لیکن میں نے ہمت کر کے چاروناچار ان سے کہہ ہی دیا کہ سر! میں مل کر آپ سے بات کرنا چاہوں گا۔ملنے

لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مجریہ 2001ء کے نفاذ کے نتیجہ میں ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی شکل ہی بگاڑ دی گئی، اس تبدیلی کو اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کا نام دیا گیا جب کہ یہ اختیارات کی بندر بانٹ کا دوسرا نام تھا

Scanned with CamScanner

اعلیٰ فوجی قیادت اور فوجی مانیٹرنگ ٹیموں کے افسران کو بھی بلایا گیا تھا
آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ کھانا شروع ہونے سے پہلے تمام انتظامی
افسران کو حکم ملا کہ وہ اپنی اپنی گاڑیوں سے نیلی بتیاں اتار دیں

کی اجازت مرحمت فرما دی گئی اور اگلی صبح ساڑھے سات بجے ان کے دفتر میں حاضر ہونے کا شاہی فرمان جاری ہوا۔

میں اگلے دن وقت مقررہ پر سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے آفس میں تھا۔ میں سلام کر کے ان کے سامنے بیٹھا تو ان کے دیکھنے کے سٹائل سے ہی مجھے یوں لگا کہ شاید وہ مجھے ہی اس کیس میں قصوروار سمجھ رہے ہوں۔ پوچھنے لگے،'' خیریت تو ہے۔تم پریشان لگ رہے ہو۔کیا ہوا؟'' میں نے عرض کی،''ڈپٹی میئر صاحب جان بوجھ کر مجھے تنگ کر رہے ہیں۔انہوں نے رسید بک اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ آرڈر شیٹ بھی ان کے قبضے میں ہے جس پر میں نے بھینس کو بعد از ادائیگی جرمانہ چھوڑنے کا حکم صادر کیا تھے۔ اور سر! وہ جرمانے کی رقم مبلغ دو ہزار روپیہ ابھی تک سٹور کیپر کے پاس ہے۔اس نے خزانہ سرکار میں جمع نہیں کروائی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس رسید بک ہی نہیں ہے، رسید کیسے کاٹے؟ اور بغیر رسید کے جرمانہ کیسے جمع کروائے؟ سر! اس نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اسے ڈپٹی میئر صاحب نے رسید کاٹنے سے اور جرمانہ خزانہ سرکار میں جمع کروانے سے منع کیا ہے''۔ کہنے لگے:''کیا وہ یہ بات انکوائری افسر کے سامنے کر دے گا؟'' میں نے کہا، سر! نہیں وہ یہ بات انکوائری افسر کے سامنے بالکل نہیں کرے گا۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں اگر یہ بات کسی اور کو بتاؤں گا تو وہ صاف مکر جائے گا''۔ فرمانے لگے،''یہ کیا بات ہوئی؟۔ مجھے تو ڈپٹی میئر صاحب نے یہ بتایا ہے کو وہ دو ہزار روپیہ آپ کے پاس ہے۔سٹور کیپر اگر یہ بات کرتا ہے تو اسے سامنے آ کر کھل کر بات کرنی چاہیے۔ وہ آپ کا ماتحت ہے۔ڈپٹی میئر کا تو نہیں۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائیں''۔ میں نے کہا:''سر! ڈپٹی میئر صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ رقم جرمانہ سٹور کیپر کے پاس ہے، میرے پاس نہیں۔آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں دو ہزار کے لیے جھوٹ بولوں گا۔ سر! یہ میرے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ ناانصافی ہے۔ بلیک میلنگ ہے ڈپٹی میئر صاحب کی۔ وہی یہ سارا کچھ کروا رہے ہیں۔ آپ بھی ہماری بات نہیں سنیں گے تو اور کون سنے گا؟''۔ سی سی او صاحب میری باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے۔ شاید ڈپٹی میئر صاحب سے تعلق کی لاج نبھا رہے تھے۔ کہنے لگے،'' آپ کے پاس دو آپشن ہیں: یا تو ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کر لو یا انکوائری بھگتو۔ تیسرا کوئی آپشن نہیں ہے''۔ میں نے عرض کی، سر! ڈپٹی میئر صاحب سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ صرف اصولوں کا جھگڑا ہے۔ کس بات کی صلح کروں ان کے ساتھ؟ اگر آپ بھی میری بات سننے کو تیار نہیں تو میں انکوائری کا سامنا کر لوں گا''۔ کہنے لگے:'' ٹھیک ہے جائیں اور انکوائری کا سامنا کریں''۔

میں سلام کر کے ان کے دفتر سے اٹھا اور سیدھا جناب ریاض احمد ریاض، جو اس وقت سینئر مجسٹریٹ تھے اور آج کل بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل) اوکاڑہ تعینات ہیں۔موصوف نیک سیرت، نیک صورت انسان ہیں۔صوم وصلوۃ کے پابند ہیں۔ ایمانداری اور دیانتداری کی تصویر ہیں۔ پوچھنے لگے: ''چودھری صاحب بڑے پریشان نظر آ رہے ہو۔ چنگے چودھری ہو، چودھری اور پریشانی! بات بنتی نہیں ہے۔آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں۔خیریت تو ہے؟''۔میں نے کہا: ''سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے میرے خلاف ایک انکوائری آپ کو بھیجی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔'' انہوں نے گھنٹی بجائی۔ نائب قاصد حاضر ہوا۔اسے کہہ کر میرے والی فائل منگوائی۔ بعد از ملاحظہ فائل میری طرف متوجہ ہوئے۔ پوچھنے لگے، '' اصل معاملہ کیا ہے؟ اس شکایت میں تو مجھے کوئی جان نہیں نظر آتی۔ شکایت کنندہ نے نہ تو اپنا نام لکھا ہوا ہے نہ کوئی ایڈریس ہے۔ یہ اہل علاقہ کیا ہوتا ہے؟ جس کو کوئی شکایت ہوتی ہے وہ سامنے آ کر بات کرتا ہے۔ ایسی درخواستیں قانون کے مطابق غیر قانونی ہوتی ہیں۔ نامعلوم مدعیان کی درخواستوں پر کوئی قانونی کاروائی نہیں بنتی۔سی سی او صاحب بادشاہ آدمی ہیں۔ان کو اس طرح کی درخواستوں کو از خود داخل دفتر کر دینا چاہیے۔آپ بتائیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟''

میں نے حسب الحکم انہیں '' الف تا یے'' ساری کہانی سنا دی۔ بات سن کر وہ خود بھی پریشان ہو گئے۔کہنے لگے، '' ڈپٹی میئر صاحب کی سی سی او صاحب سے بڑی گہری دوستی ہے۔وہ تقریباً روزانہ ہی سی سی او صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔حکومتی پارٹی کے ہیں۔لارڈ میئر اور شریف برادران سے بھی ان کے مراسم کافی گہرے ہیں لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔آپ سچے ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔آپ جا کر سکون سے اپنا کام کرو۔ میں یہ درخواست داخل دفتر کر دوں گا۔ ہاں آپ اپنا تحریری بیان ایک دو دنوں میں کسی کے ہاتھ بھجوا دینا۔ میں ان کا شکریہ ادا کر کے سلام کر کے ان کے دفتر سے نکلا اور اپنے دفتر آ گیا۔ دفتر آ کر سٹور کیپر کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنا بیان لکھ کر دے کہ مبلغ دو ہزار روپیہ اس کے پاس ہے۔رسید بک اور دیگر دستاویزات ڈپٹی میئر کی تحویل میں ہیں۔ رسید بک موجود نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو اس نے رسید کاٹی ہے اور نہ ہی رقم خزانہ سرکار میں جمع کروائی ہے۔لیکن سٹور کیپر نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا، '' سر! میں آپ سے پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ میں ڈپٹی میئر صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا۔ آپ میرے خلاف قانونی کارروائی کے لیے سی ای او صاحب کو تحریر کر دیں۔ میں انکوائری بھگت لوں گا''۔اس کو چونکہ معلوم تھا کہ وہ ڈپٹی میئر کا چہیتا ہے

افسروں کو کھانے پر بلا کر ان کی جس طرح باجماعت توہین
کی گئی وہ اپنی مثال آپ ہے اور اس توہین سے بھی
ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا

کچھ بیوروکریٹ ہمارے ملک کے وزیراعظم بھی بنے اور باقی محلاتی سازشوں میں پڑ گئے، جب بھٹو مرحوم وزیراعظم تھے تو تب بھی سی ایس پی کلاس پر کاری ضرب لگائی گئی لیکن ہم نے اپنا قبلہ درست نہ کیا

اور ڈپٹی میئر کا سی سی او صاحب سے گہرا تعلق ہے۔ ان حالات میں اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی یہ باتیں سن کر میں نے سپرنٹنڈنٹ کو بلایا۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے سی سی او صاحب کو ایک چٹھی تحریر کروائی۔ دستخط کیے اور ارسال کر دی۔ ساتھ ہی میں نے اپنا جواب لکھا اور سپرنٹنڈنٹ کو دیا کہ وہ اگلے دن جواب انکوائری افسر کے پاس جمع کروا آئے۔

کوئی پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ جناب سردار ریاض احمد ریاض کا فون آیا کہ میں کسی اہلکار کو بھیج کر انکوائری رپورٹ کی کاپی منگوا لوں اور ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے شکایت/ درخواست داخل دفتر فرما دی ہے یعنی مجھے بری کر دیا ہے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے: ''میرا نہیں اللہ کا شکر ادا کرو۔ خوش قسمت ہو کہ سی سی او صاحب نے آپ کے خلاف انکوائری میرے پاس بھیج دی۔ اگر یہی انکوائری کسی دیگر افسر کے پاس ہوتی۔ اگرچہ یہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھی تو اس افسر نے اپنی نوکری سیدھی کرنے اور جناب سی سی او صاحب اور ڈپٹی میئر کو خوش کرنے کے لیے آپ کے خلاف لکھ دینا تھا اور آپ کا کیریر خراب ہو جانا تھا۔ جب میری بریت کی خبر ڈپٹی میئر تک پہنچی تو وہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہونے کی بجائے آگ بگولہ ہو گیا۔ گاڑی پکڑی اور سیدھا سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے دفتر پہنچا۔ گلے شکووں کے انبار لگائے۔ سی ای او صاحب سے ناراضی کا اظہار کیا۔ شنید ہے کہ یہ بھی کہا کہ آپ نے اپنے افسر کو بچانے کے لیے انکوائری ریاض احمد ریاض کے سپرد کی۔ کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ موصوف بلا خوف وخطر، بغیر سیاسی یا بیوروکریٹک دباؤ قبول کیے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے میرٹ پر فیصلہ کرتے ہیں۔

جب بات نہ بنی تو ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد نے ایک ہفتے کے بعد ایک شکست خوردہ جرنیل کی طرح ایک اور چال چلی۔ مجھے سی ای او صاحب کا فون آیا۔ ان کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔ کہنے لگے،'' چوہدری صاحب آپ کی ایک اور شکایت آ گئی ہے۔ فلاں تاریخ کو شام کے وقت آپ کی زیر استعمال سرکاری جیپ بکر منڈی بند روڈ، لاہور میں موجود پائی گئی اور آپ نے وہاں پر لوگوں سے بھتہ بھی وصول کیا اور اس کی کوئی رسید جاری نہ کی۔ ابھی تو مجھے زبانی شکایت موصول ہوئی ہے ایک آدھ دن میں تحریری شکایت میرے پاس پہنچ جائے گی۔ آپ باز کیوں نہیں آتے؟ آپ اب پھر نوکری سے استعفا دینے کی بات کرو گے؟'' میں تھوڑا پریشان تو ہوا لیکن یہ پریشانی چند ساعتوں کی تھی۔ میں نے سی سی او (چیف کارپوریشن افسر) سے عرض کی،'' سر! اس شکایت کا حشر بھی انشااللہ پہلے والی شکایت کی طرح کا ہوگا۔ میں اس کا بھی سامنا کروں گا اور مجھے اپنے اللہ پر

یقین کامل ہے کہ میں اس آزمائش سے بھی سرخرو ہوں گا''۔

فون بند ہوگیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ میری سرکاری جیپ بکر منڈی کیسے پہنچ گئی؟ میں تو وہاں گیا ہی نہیں تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ڈپٹی میئر صاحب کے کارِ خاص سینئر مجسٹریٹ زون نمبر۔8 نے مجھ سے ایک دن جیپ منگوائی تھی۔ تو اس گھٹیا سازش کی کڑیاں ملنا شروع ہوگئیں۔

ہوا یوں کہ ایک دن وہی سینئر مجسٹریٹ صاحب میرے دفتر تشریف لائے۔ کہنے لگے،''چودھری صاحب! آپ کی بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کو آج ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ میری جیپ خراب ہے اور میرے پاس کوئی ذاتی گاڑی نہیں ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو آج شام کو اپنے والی سرکاری جیپ مع ڈرائیور میرے گھر بھیج دینا۔ آپ کی بھابی کو ڈاکٹر کو دکھا کر گاڑی واپس بھیج دوں گا۔'' میں نے کہا، ''سر! کوئی بات نہیں۔ میرے لیے یہ کام سعادت سے کم نہیں۔ میں شام کو جیپ مع ڈرائیور آپ کے گھر بھیج دوں گا''۔ چنانچہ میں نے ازراہ ہمدردی شام کو سرکاری جیپ مع ڈرائیور جناب سینئر مجسٹریٹ صاحب کے گھر بھجوادی۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ میرا ڈرائیور بھی تو ساتھ ہی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی اس سازش کا حصہ ہے۔ ڈرائیور کو بلایا اور اس سے پوچھا،''جس دن تم سرکاری جیپ لے کر سینئر مجسٹریٹ صاحب کے پاس گئے تھے تو تم لوگ کہاں کہاں گئے تھے؟'' کہنے لگا،''سر! میں جب ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر فارغ کردیا کہ دو گھنٹے کے بعد آکر جیپ واپس لے جانا۔ میرا گھر ان کے گھر سے قریب ہی ہے۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد واپس گیا تو اس وقت تک جیپ واپس نہیں آئی تھی۔ مجھے تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا''۔ میں نے استفسار کیا،''جب جیپ واپس آئی تو اس میں کون کون لوگ تھے؟'' کہنے لگا، ''سر! مجسٹریٹ صاحب، ان کا ڈرائیور اور ایک نامعلوم شخص جیپ سے اترا تھا''۔ مجھے پوری کہانی سمجھ آگئی۔ دراصل ڈپٹی میئر صاحب نے سینئر مجسٹریٹ، جو ان کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھا کے ساتھ مل کر یہ چال چلی اور مجھے کرپشن کیس میں پھنسانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔ میری سرکاری جیپ کو بکر منڈی لے جایا گیا اور وہاں لوگوں سے دھونس سے رقم وصول کی گئی۔ افسوس تو مجھے اپنے سینئر کولیگ پر ہوا کہ انہیں ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ اور ڈپٹی میئر کو خوش کرنے اور اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈا کرنے کے لئے اتنی شرمناک اور گھٹیا حرکت کیوں کررہے ہیں؟

میں اگلے دن علی الصبح ہی سی سی او کے دفتر پہنچ گیا۔ سی سی او صاحب مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ کہنے لگے''خیریت تو ہے کہ آج آپ صبح صبح ہی ٹپک پڑے؟'' میں نے ایک ہی سانس میں سرکاری جیپ والا پورا قصہ انہیں سنادیا۔ میری بات سن کر وہ حیران

ہمارے ڈپٹی کمشنرز ماسوائے چند استثنائی صورتوں کے پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جوڈیشل انکوائری کے لیے اس کی مرضی کا مجسٹریٹ مقرر کرتے رہے اور ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کو''ہتھ ہولا'' رکھنے کا بھی کہتے رہے

Scanned with CamScanner

بہت سے افسران نے نئے سسٹم میں کام کرنے سے انکار کر دیا، بہت سے لمبی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے یا ملک سے باہر چلے گئے، بعض نے تو اتنی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ وہ اور ان کے ماتحت لوگ ناظمین کے ناجائز احکامات مانتے رہے

بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ اچانک کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھنے لگے۔ ''یہ ملک صاحب۔ سینئر مجسٹریٹ صاحب تو آپ کی سروس سے نہیں ہیں؟ انہوں نے ایسی حرکت کیوں کی؟ وہ کیوں ڈپٹی میئر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں؟ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

سی سی او کے چبھتے ہوئے سوالات میرے لئے مزید پریشانی کا باعث بن رہے تھے۔ کیونکہ سینئر مجسٹریٹ صاحب میری ہی پی سی ایس سروس سے تھے۔ سی سی او صاحب کا تعلق ڈی ایم جی گروپ سے تھا۔ ان کے کہنے کا مطلب شاید یہ تھا کہ ان کے گروپ کا کوئی افسر شاید اس طرح کی حرکت کبھی نہ کرتا۔ میرے پاس ان کی اس سوچ کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ یہ کام میری ہی سروس کے ایک افسر نے کیا تھا۔

میں نے عرض کی: ''سر! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے حقائق آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ آپ بااختیار ہیں۔ عقل و دانش کے منبع ہیں۔ تجربہ کار بھی ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ میں تو سروس میں نووارد ہوں اور نوخیز بھی۔ میں نے تو آپ ہی سے راہنمائی لینی ہے اور اپنے مسائل بھی آپ سے ہی شیئر کرنے ہیں۔'' میری یہ باتیں سن کر موصوف زیر لب مسکرائے۔ میرا تیر شاید نشانے پر لگا تھا۔ ظاہر ہے مجھ سمیت تعریف کس کو پسند نہیں ہوتی۔ کہنے لگے، آپ جاؤ اپنا کام کرو میں دیکھ لیتا ہوں۔''

میں نے انہیں سلام کیا اور واپس اپنے دفتر آ گیا۔ اب ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد نے تیسرا وار کیا لیکن وہ بھی خطا گیا اور اللہ کے حکم سے ان کے شر سے خیر کا پہلو نکل آیا۔ ہوا یوں کہ ڈپٹی میئر صاحب پھر سے سی سی او کے پاس گئے اور انہیں تجویز دی کہ میرا تبادلہ زون نمبر۔2، میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ تجویز کیوں دی؟ اس تجویز کے پس پردہ بھی ایک لمبی کہانی تھی۔ اس وقت میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور آٹھ زونوں پر مشتمل تھی اور اس وقت کے آٹھوں ڈپٹی میئرز مسلم لیگ۔نون کے تھے۔ بعد میں دو ڈپٹی میئر چودھری محمد اظہر، جو اس وقت گورنر پنجاب تھے، کے گروپ میں شامل ہو گئے۔

ان میں سے ایک ڈپٹی میئر جن کا نام چودھری محمد سرور تھا وہ زون نمبر۔2 کے ڈپٹی میئر تھے۔ وہ چونکہ سیاسی طور پر حکومتی پارٹی مسلم لیگ (ن) کے مخالفین میں شامل تھے اس لیے اسے ناکام کرنے کے لیے میرے جیسے افسر کو جو صرف میرٹ پر کام کرتا ہو اور سیاستدانوں کی جی حضوری نہ کرتا ہو۔ ان کے زون میں سیکرٹری زون/سپیشل مجسٹریٹ درجہ اول لگانے کی تجویز دی گئی۔ یہ تجویز اس وقت کے لارڈ میئر جناب خواجہ احمد حسان کے سامنے رکھی گئی جو منظور کر لی گئی۔ اگلے ہی دن میرا تبادلہ زون نمبر۔2 میٹروپولیٹن کارپوریشن، لاہور میں کر دیا گیا لیکن میرے لیے یہ ہجرت مبارک ثابت ہوئی۔ ایسے لگا

Scanned with CamScanner

جیسے ''کبے کولٹ کاری!''۔ میں جب زون نمبر۔2 کے ڈپٹی میئر چودھری محمد سرور گجر کو ملا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔فوری طور پر میرے لیے دفتر کا بندوبست کیا اور ساتھ یہ بھی کہا،'' چودھری صاحب آپ کے ساتھ جو کچھ زون نمبر آٹھ میں ہوتا رہا ہے سب کچھ میرے علم میں ہے۔ یہاں آپ کو انشااللہ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔آپ حسب قانون اپنا کام کریں۔میں یا میرا کوئی بھی نمائندہ آپ کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ مجھے آپ کا میرٹ پر کام کرنا بہت اچھا لگے گا''۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایک وہ بھی ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد تھا اور ایک یہ ڈپٹی میئر چودھری محمد سرور ہے۔لیکن رویوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ ڈپٹی میئر حزب اقتدار والا تھا اور یہ حزب اختلاف والا۔ یا وہ ایڈووکیٹ تھا اور یہ سادہ آدمی ہے۔ میں نے اس ڈپٹی میئر کو بڑا شفیق، رحمدل، نفیس اور ایماندار شخص پایا۔ان کی وفات تک میرے ان سے تعلقات رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ راحتیں نصیب فرمائے۔آمین

اب یہاں پر مجھے اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ میں ضلع منڈی بہاؤالدین میں بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل/ فنانس اینڈ پلاننگ) خدمات سر انجام دے رہا تھا کہ 2018ء کے الیکشن آگئے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں ایک رواج بن چکا ہے کہ ہر نئے الیکشن کی آمد پر افسران کی وہ اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے کہ الامان، الحفیظ۔خواہ مخواہ ہی افسران کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیج کر ٹی اے/ڈی اے کی مد میں ریاست کو کروڑوں روپے کا ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے۔ ایسے تبادلوں کا کیا فائدہ کہ آپ متوقع طور پر جیتنے والی سیاسی جماعت کے نمائندگان کی سفارشات پر افسران کی تبدیلی اور تعیناتی کریں اور دعویٰ یہ کریں کہ سب کچھ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کروانے کی غرض سے کیا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں اس ملک کے غریب اور سادہ عوام کے ساتھ کب تک ایسا گھناؤنا مذاق جاری رکھا جائے گا۔اس طرح سے ان کے مینڈیٹ کو کب تک چوری کیا جاتا رہے گا؟ بھئی افسران کون سے کسی سیاسی پارٹی کے ارکان ہوتے ہیں۔وہ تو ریاست کے ملازم ہوتے ہیں۔وہ تو ہر آنے والی حکومت کے خادم ہوتے ہیں۔وہ کسی بھی حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری تاریخ میں ایک بھی ایسا واقعہ ریکارڈ پر موجود نہیں ہے کہ کسی سرکاری افسر نے عبوری حکومت کے دوران بھی کسی حکومتی حکم کی نافرمانی کی ہو۔

یہ اندھا دھند تبادلے دراصل کسی نئی سیاسی گیم کا حصہ ہوتے ہیں جس کو عام بندہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں ہمارے منڈی بہاؤالدین کے ڈپٹی کمشنر صاحب کا بھی تبادلہ کر دیا گیا حالانکہ وہ افسر صرف اور صرف میرٹ پر کام کرنے والا فرض شناس، کام کو سمجھنے والا، عوام کا ہمدرد، اور نوری

بہت سارے افسران نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا نہ تو اپنی عزت نفس مجروح ہونے دی نہ اپنے ماتحتوں کی، ان کو ناپسندیدہ شخصیات قرار دے کر ضلع بدر کیا گیا لیکن انہوں نے صبر واستقامت، ایمانداری، عزم وہمت اور جرات وبہادری کا دامن نہ چھوڑا

جج صاحبان نے تحصیل دار کے دفتر کا تالا توڑا اور دفتر کا سامان باہر پھینک دیا، میں سوچ میں پڑ گیا کہ جن لوگوں نے مظلوموں کی مدد کرنا تھی، ظالموں سے قبضے چھڑوا کر مظلوموں کے حوالے کرنے تھے وہ خود ہی قبضہ گروپ بن گئے ہیں

انصاف فراہم کرنے والے شخص تھے۔ان کے جانے کے بعد اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر ایک ایسے افسر کو لگا دیا گیا جو مجھ سے چار اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو) سے دو بیچ جونیئر تھا۔ مجھے وہاں سے تبدیل کر کے ایک ڈویژنل ہیڈ کوارٹر پر ایڈیشنل کمشنر/ڈائریکٹر ڈویلپمنٹ اینڈ فنانس مقرر کر دیا گیا اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو) کو بھی وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ نئے آنیوالے ڈی سی صاحب موصوف اس سے پہلے اس ضلع میں بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو) کام کرتے رہے تھے۔

ان کی اس وقت کی حکومتی پارٹی کے ایک ایم این اے سے کسی وجہ سے چپقلش ہوگئی تو اس ایم این اے کے کہنے پر ان کا اس ضلع سے تبادلہ کر دیا گیا تھا۔اور اب وہی ایم این اے پھر سے اسی سیٹ سے ایم این اے کا دوبارہ الیکشن لڑ رہا تھا۔سوچنے کا مقام یہ ہے کہ افسر موصوف کا دوبارہ تبادلہ منڈی بہاؤالدین میں منصفانہ اور آزادانہ انتخاب کروانے کے لیے کیا گیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موصوف کی تعیناتی اس ضلع میں اس شخص نے کروائی جس کا تعلق متوقع جیتنے والی سیاسی جماعت سے تھا اور ہونے والے الیکشن میں اسی حلقہ سے ایم این اے کا امیدوار بھی تھا جس حلقہ سے سابقہ حکومت کا وہی سابقہ ایم این اے بھی الیکشن لڑ رہا تھا، جس کے کہنے پر نئے آنے والے ڈپٹی کمشنر صاحب کا اس ضلع سے تبادلہ ہوا تھا۔کیا اسے کہتے ہیں منصفانہ، آزادانہ اور شفاف انتخابات!

یہاں پر ایک دکھ بھری اور دردناک بلکہ شرمناک حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے میرا کلیجہ منہ کو آ رہا ہے، لیکن اس تکلیف دہ اور دکھ بھری داستان کو مکمل کرنے کے لیے حقائق آشکار کئے بغیر چارہ نہیں۔ جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ سیاست دانوں کی توقعات کو ہمارے اپنے ہی افسران اس حد تک بڑھا دیتے ہیں جن پر پورا اترنا ہر افسر کے بس کی بات نہیں۔اور پھر ایسے سیاستدان ہر اس افسر کا جینا حرام کر دیتے ہیں جو میرٹ کا نام لیتا ہو۔مذکورہ ضلع میں بھی حاکم ضلع نے ایک ایسی انوکھی مثال قائم کی جس کی کوئی مثال شاید ماضی میں نہ ملے۔ پھر انہیں خود اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

ہوا یوں کہ نئے آنے والے ڈپٹی کمشنر صاحب نے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری گاڑی اپنی سابقہ پوسٹنگ کی جگہ پر مع ڈرائیور منگوائی۔ کیوں کہ انہوں نے دفتر میں آ کر جائن کرنا تھا۔ دفتری عملہ کو پابند کیا گیا کہ ان کی تشریف آوری تک دفتر نہ چھوڑے۔ دفتر میں پورا عملہ شام تک ان کا انتظار کرتا رہا لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دفتر تشریف نہ لائے۔رات گئے عملے کو ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں طلب کیا گیا اور جائننگ رپورٹ پر دستخط کر کے اعلیٰ حکام کو ارسال کر دی گئی۔ بعد میں پتہ یہ چلا کہ صاحب بہادر چونکہ اس ضلع میں پہلے بھی تعینات رہ چکے تھے۔ملازمین سے جان پہچان بھی تھی۔ کسی وفادار ماتحت کو حکم دیا گیا کہ

مٹھائی اور گلدستہ تیار رکھے۔ یہ کام بڑی رازداری سے کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کون کسی کا راز اپنے پاس رکھتا ہے۔ اسی طرح حسب معمول بعد میں یہ راز بھی راز نہ رہا۔ موصوف جائن کرنے سے پہلے ہی سرکاری گاڑی میں اس وقت کی متوقع جیتنے والی سیاسی جماعت کے مرکزی عہدیدار چودھری اشفاق کے گھر گلدستہ اور مٹھائی لے کر ان کا شکریہ ادا کرنے گئے۔ کیونکہ موصوف انہی کی سفارش پر ڈپٹی کمشنر لگے تھے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الیکشن میں دھاندلی کا پروگرام کس طرح سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ جب آپ کسی سیاسی شخصیت کے کندھوں پر بیٹھ کر کوئی بھی سرکاری عہدہ حاصل کریں گے اور اس طرح کی ناپائیدار عارضی بیساکھیاں استعمال کریں گے تو ایسے سیاستدان آپ کو اپنا زر خرید غلام نہیں سمجھیں گے تو اور کیا سمجھیں گے!

موصوف ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پہلے تو اس سیاسی شخصیت چودھری اشفاق اور ان کے بیٹے نے ڈپٹی کمشنر صاحب کے کمیٹی روم پر قبضہ کیا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ڈپٹی کمشنر صاحب والی کرسی پر باری باری بیٹھتے تھے۔ سائلین کی درخواستیں وصول کرتے تھے اور ان پر احکامات بھی جاری کرتے، بے چارے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر اپنے سر پر ڈی سی کے عہدے کا اعزازی تاج سجائے اپنے دفتر میں بیٹھ کر مکھیاں مارا کرتے تھے۔ اب ان دونوں سیاسی راہنماؤں نے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے ریٹائرنگ روم پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے وہاں بیٹھ کر سائلین کو بلا کر احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے۔ ان کی اس قبیح حرکت پر جناب ڈی سی صاحب بہادر کی یادداشت واپس آ گئی۔ شاید ان کو تھوڑا بہت غصہ بھی آیا ہوگا۔ انہیں یاد آ گیا کہ حکومت پنجاب نے تو انہیں اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر تعینات کیا تھا۔ پتہ نہیں موصوف نے کیسے اتنی ہمت کر لی اور سیاسی راہنماؤں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اس ضلع کا ڈی سی وہ ہے لیکن بدقسمتی سے سیاستدانوں نے ایسا ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ موصوف اپنی پگڑی بہت پہلے ہی ان کے حوالے کر چکے تھے اور اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

اب ڈی سی صاحب موصوف نے اسی سیاسی جماعت کے ایک اور گروپ کی انتہائی طاقتور شخصیت سے رابطہ کر لیا۔ ان کی بیگم کو ڈی سی ہاؤس میں منعقد کی گئی محفل میلاد میں بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا۔ ضلع کے تمام افسران کی بیگمات کو بھی مہمان خصوصی کے استقبال کے لیے خصوصی طور پر دعوت دی گئی اور اپنی گرہ خاص سے مہمان خصوصی کو تحفے تحائف دے کر رخصت کیا لیکن پھر بھی بات نہ بن سکی کیونکہ سیاستدان خود تو اپنی جماعت میں لوٹوں کو انتہائی خوشدلی سے قبول کر لیتے ہیں اور ان کو خوش آمدید بھی کہتے ہیں۔ پتہ نہیں ان کو بیوروکریسی کی لوٹا کریسی کیوں پسند نہیں آتی؟ ڈی سی صاحب اب کافی پریشان ہو گئے۔ وہ ایک لمبے عرصہ تک اس ضلع میں

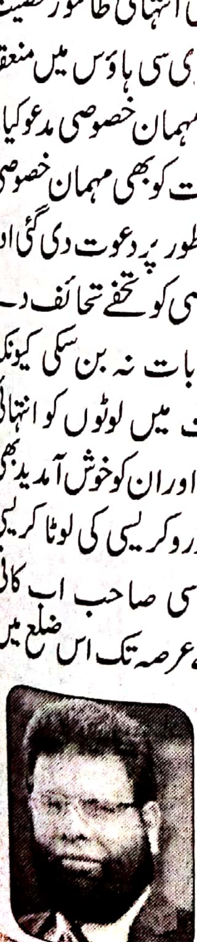

ڈی سی او صاحب فرمانے لگے، سیشن جج صاحب بہت غصے میں ہیں، انہوں نے ضلع ناظم سے بھی بات کی ہے وہ بھی آپ سے بہت ناراض ہیں، آپ کو اس طرح عدلیہ کا سامان باہر نہیں پھینکنا چاہیئے تھا

ضلع جہلم کی زمین تنگ کردی گئی اور میں نے وہاں سے اپنا تبادلہ کروالیا خاموشی سے اپنے عہدے کا چارج چھوڑ کرنئی تعیناتی والی جگہ پر نئے جذبے کے ساتھ اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے شروع کردیئے

ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی تک بہت جونیئر تھے اور نام نہاد میرٹ کی بنیاد پر ڈپٹی کمشنر لگے تھے۔

اب ڈی سی صاحب بہادر نے اپنی پریشانی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے ایک اور سکیم سوچی۔ اسی ضلع میں اسی سیاسی جماعت کا ایک تیسرا گروپ بھی تھا۔ اس گروپ کے دو حکومتی وزرا بھی تھے۔ موصوف نے اب اس گروپ کی جھولی میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ اب سارا ضلعی پروٹوکول اس گروپ کے لیے مختص کر دیا گیا۔ اب اس والے گروپ کا سربراہ ضلع کے ہر فنکشن کا مہمان خصوصی بننے لگا۔ دوسرے دونوں گروپ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ڈی سی صاحب بہادر کی تمام تر حرکات وسکنات کا خوردبینی جائزہ بھی لے رہے تھے۔

بالآخر جو سیاسی گروپ ڈپٹی کمشنر صاحب کو ضلع میں لے کر آیا تھا اس گروپ کی انا کا مسئلہ بن گیا۔ اسی گروپ نے مختلف بے بنیاد اور جھوٹے الزامات کے تحت محترم ڈپٹی کمشنر صاحب کے خلاف اپنی ہی مدعیت میں محکمہ انٹی کرپشن میں درخواست دائر کر کے انکوائری لگوادی۔ اور ساتھ ہی وزیر اعلیٰ پنجاب کو ضلع کا دورہ کرنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ وزیر اعلیٰ صاحب دورہ پر تشریف لے آئے۔ حکومتی جماعت کے تقریباً تمام سیاستدانوں نے باہم مشورہ کر کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہی دفتر میں بیٹھ کر جناب محترم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے خلاف الزامات کے ڈھیر لگا دئے۔ ڈی سی صاحب نے جناب وزیر اعلیٰ صاحب کو دکھانے کے لئے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کو تیار کروا رکھا تھا لیکن ضلع کے سارے سیاستدان مل کر جناب وزیر اعلیٰ صاحب کو سٹی ہسپتال لے گئے۔ جب وزیر اعلیٰ صاحب سٹی ہسپتال پہنچے تو ہسپتال کے حالات ناقابل بیان حد تک برے تھے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وزیر اعلیٰ نے جناب ڈپٹی کمشنر صاحب کا فوری طور پر تبادلہ کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ یہ واقعات پڑھ کر قارئین کو یقیناً اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہمارے ملک کے بیوروکریٹس کی ایک بہت بڑی تعداد کچھ اس سے ملتی جلتی حرکتیں کر کے ہی اپنے سیاسی آقاؤں سے خلعت شاہی بلکہ خلعت حکمرانی کہہ لیجیے، کا حصول ممکن بناتی ہے۔

1998ء میں جب جنرل پرویز مشرف نے جمہوریت پر شب خون مارا اور ایک منتخب وزیر اعظم نواز شریف کو اقتدار سے نکال کر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھالی تو اس نے ہر ڈکٹیٹر کی طرح نام نہاد اصلاحات کے نام پر قومی اداروں کو تباہ وبرباد کرنے کا آغاز کیا۔ ان اصلاحات میں ناظمین والا لوکل گورنمنٹ نظام مجریہ 2001ء بھی تھا۔ یہ نظام کیا تھا؟ بھان متی کا کنبہ تھا۔ اتنا ناقص نظام کہ اس کے نفاذ کے پہلے سال ہی اس میں ڈکٹیٹر کو بے شمار ترامیم کرنا پڑیں اور پھر بھی یہ غیر فطری نظام نہ چل سکا اور بالآخر یہ نظام اپنی موت آپ مر گیا۔ بظاہر تو یہ نظام

اس لئے لایا گیا تھا کہ اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کیا جائے لیکن اختیار نچلی سطح تک تو منتقل نہ ہو سکے البتہ ضلعی ناظمین کے پاس اختیارات کا ارتکاز ضرور ہوا اس نظام کے تحت ملک کے انتظامی ڈھانچے کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات ختم کر کے اسے ''ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر'' بنا کر ضلعی ناظم کے ماتحت کر دیا گیا اور تحصیل ناظمین کو بھی یہ تاثر دیا گیا کہ اسسٹنٹ کمشنرز ان کے ماتحت کام کریں گے۔

چنانچہ ناظمین کی اکثریت نے اپنے دیے گئے اختیارات سے وہ تجاوز کیا کہ الامان والحفیظ۔ اس کا خمیازہ قوم ابھی تک بھگت رہی ہے اور ہماری آنے والی نسلیں بھی اسے بھگتیں گی۔ اس نظام کے مطابق پولیس کو مادر پدر آزاد کر دیا گیا اور مختلف سطحوں پر پبلک سیفٹی کمیشن تشکیل دیے گیے جن کے چیئرمین اور ممبران سیاسی لوگ تھے۔ انہیں پولیس کے خلاف شکایات سننے کا کام سونپا گیا۔ یہ کیسا خوبصورت نظام تھا کہ پولیس کے خلاف ان لوگوں نے شکایات سننا تھیں جو چوبیس گھنٹے اپنے حامیوں کو پولیس حراست سے چھڑوانے اور اپنے مخالفین کے خلاف جھوٹے مقدمے درج کروانے کے لیے ایس ایچ اوز، ایس ڈی پی اوز اور ڈی پی اوز کے دفاتر کے طواف کرتے رہتے تھے۔ امن عامہ برقرار رکھنے کا اختیار انتظامیہ سے لے کر ضلعی ناظم کو دے کر عوام کے ساتھ ایک اور مذاق کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ پولیس نے کبھی ضلع ناظم کے اس اختیار کو دل سے تسلیم نہ کیا اور تسلیم بھی کیوں کرتی جب ناظمین نے پولیس سے ذاتی کام ہی لینے تھے اور یہ ناظمین کی سیاسی مجبوری بھی تھی۔ محکمہ مال جیسے اہم محکمہ کو بھی ضلعی حکومتوں کا حصہ بناتے ہوئے اس ملک کا اتنا نقصان کیا گیا جو شاید کبھی پورا نہ ہو سکے۔

اگرچہ بعد میں ایک ترمیم کے ذریعے محکمہ ریونیو کو ضلع ناظم کی ماتحتی سے نکال کر بلاواسطہ صوبائی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس حوالے سے میں اپنی سروس کے دوران پیش آنے والے صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو میرے موقف کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ اگرچہ کچھ ضلعی ناظمین نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کیا اور عوام الناس کو ریلیف بھی دیا لیکن وہ کام اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں تعمیر و ترقی کے کام بہت زیادہ ہوئے لیکن اس کی وجہ ناظمین کی حکمت عملی اور جانفشانی نہ تھی بلکہ فنڈز کی فراوانی تھی اور اگر آج بھی اضلاع کو مناسب فنڈز دیے جائیں تو تعمیر و ترقی کا کام ان سے بہت ہی بہتر انداز میں ہو سکتا ہے۔

میں ان دنوں ضلع جہلم میں تعینات تھا۔ ایک دن حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا کار سرکار نمٹا رہا تھا کہ میرے پی اے نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی کہ ایک سٹوڈنٹ مجھے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے ملنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مجھ سے مل کر کوئی بات

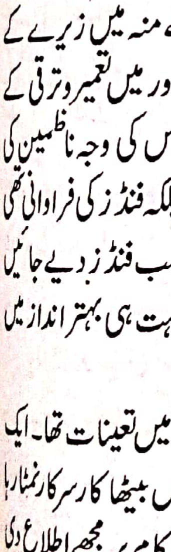

امن عامہ برقرار رکھنے کا اختیار انتظامیہ سے لے کر ضلعی ناظم کو دے کر عوام کے ساتھ ایک اور مذاق کیا گیا، پولیس نے کبھی ضلع ناظم کے اس اختیار کو دل سے تسلیم نہ کیا

ضلعی ناظمین نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کیا اور عوام الناس کو ریلیف بھی دیا لیکن وہ کام اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا

بتانا چاہتا ہے۔ میں نے سائل کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ بیٹھ تو گیا لیکن ایسے لگ رہا تھا کہ اس کو شاید زبردستی کرسی پر بٹھایا گیا ہے۔ دراصل وہ گھبرایا ہوا تھا اور شاید پہلا موقع ہو کہ کسی افسر نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا کہا ہو۔ میں نے اسے کہا کہ بیٹا سکون سے بیٹھو اور اپنی بات سناؤ۔ اس نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے اپنی دردبھری کہانی ان الفاظ میں سنائی: ’’سر جی۔ میرا نام ساجد ہے اور میں ایف ایس سی کا طالب علم ہوں۔ جس تحصیل کے آپ کلکٹر ہیں میں اس تحصیل کا رہائشی ہوں۔ ہمارے والد صاحب کی ملکیت میں کچھ زرعی رقبہ تھا۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ میرے والد صاحب سعودی عرب میں ملازمت کرتے تھے، ہماری والدہ صاحبہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے ہم تینوں بہن بھائی اپنے والد صاحب کے ساتھ ہی سعودی عرب میں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارے والد صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب والد صاحب کے انتقال کے بعد ہم پاکستان آئے اور اپنی زمینوں پر گئے تو کیا دیکھا کہ ہمارے قریبی رشتہ داروں نے ہماری زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ جب ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ تمہاری کوئی زمین یہاں نہیں ہے۔ یہ تو ہماری زمین ہے۔ ہم بہت پریشان ہوئے۔ بالآخر ہم نے جب ریونیو ریکارڈ چیک کروایا تو پتہ چلا کہ یتیم بچوں کے والد صاحب کو لاولد ظاہر کر کے ان کی وراثت کے انتقالات ان کے قریبی رشتہ داروں کے نام تصدیق ہو چکے ہیں‘‘۔

یہ کہہ کر اس نے تمام قومی شناختی کارڈوں کی اصل کاپیاں اور فارم ’’ب‘‘ کی اصل کاپی میرے سامنے رکھ دی۔ میں یہ بات سن کر تلملا اٹھا اور سوچنے لگا کہ انسان کتنا ظالم ہے، یہ اپنی موت کو کیوں بھول جاتا ہے، اس کو یاد کیوں نہیں رہتا کہ آج وہ کسی کی وراثت ہڑپ کر رہا ہے اور کل کو اس کی اپنی بھی وراثت تقسیم ہونی ہے اور وہ خالی ہاتھ دنیا سے جائے گا۔ دنیا میں کیے گئے ظلم اور زیادتیوں کا حساب صرف اور صرف اسی کو دینا ہو گا۔ کیونکہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ روز محشر ماں باپ اپنے بچوں کو اور بچے اپنے ماں باپ تک کو نہیں پہچانیں گے۔ نفسا نفسی کا عالم ہو گا۔ اور یہ دنیا میں اکٹھا کیا گیا مال و زر کسی کے کام نہیں آئے گا۔ خیر، میں ذرا سنبھلا تو اس سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اس ضمن میں کیا کیا ہے یعنی کوئی قانونی چارہ جوئی کی یا نہیں؟ اس نے بتایا، ’’سر ہم نے دونوں وراثتی انتقالات کے خلاف ڈی ڈی ڈو۔ آر/اسسٹنٹ کمشنر یعنی آپ کی عدالت میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ مقدمہ عرصہ دراز سے چل رہا ہے، تاریخ پر تاریخ دی جا رہی ہے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہیں ہو رہی۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب جن کے پاس اس سیٹ کا ایڈیشنل چارج تھا انہوں نے بھی کوئی پیش رفت نہیں کی۔ البتہ جب سے آپ

آ ئے ہیں کیس کی کارروائی میں تیزی آئی ہے اور اب کیس بحث میں ہے''۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ تسلی رکھے۔انشاء اللہ فیصلہ میرٹ پر ہوگا لیکن اس کو شاید میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔کہنے لگا:''سر! ہم یتیم اور بے سہارا بچے ہیں، ہمیں انصاف کون دے گا،آپ ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہیں۔ہم دعاؤں کے علاوہ آپ کو کیا دے سکتے ہیں؟ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری مادر وطن میں اس طرح سے بھی ظلم اور زیادتی ہو سکتی ہے''۔میں نے اسے حوصلہ دیا اور پھر سے یقین دہانی کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ اس کے کیس کا فیصلہ میرٹ ہی پر ہوگا تو اس نے پھر کہا۔''سر! ہمارا تو اس سسٹم سے اعتماد ہی اٹھ گیا ہے'' اور مزید کہا،''سر! ہمارے مخالفین ضلع ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف(موجودہ وفاقی وزیر فواد چودھری کے چچا) کے خاص بندے ہیں۔شنید ہے کہ ضلعی ناظم نے ہی تحصیلدار صاحب کو بلا کر مذکورہ انتقالات تصدیق کرنے کا حکم صادر کیا ہے''۔

یہ بات کہہ کر اس نے بڑی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔شاید سوچ رہا تھا کہ میں بھی تو ضلع ناظم کا ہی ماتحت ہوں۔اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا ہوں۔مجھے اس کی باتیں سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی کیونکہ یہ میرے محکمہ کی بدنامی کی بات تھی۔میں نے اسے پھر یقین دلانے کی کوشش کی کہ فیصلہ میرٹ پر ہوگا۔ لیکن پتہ نہیں اس کو میری باتوں پر یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔میں نے اس سے آئندہ تاریخ پیشی پوچھی اور اسے اس ہدایت کے ساتھ رخصت کیا کہ وہ مقررہ تاریخ پیشی پر اپنے وکیل سے کہے کہ وہ اپنی بحث مکمل کرے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے عدالتی مثلیں منگوا کر ان کو ملاحظہ کیا اور بعد میں اپنی تسلی کے لیے متعلقہ ریونیو آفیسر جو بظاہر تو میرا ماتحت تھا لیکن عملاً کسی اور کا تھا، کو بلا کر بھی پوچھا لیکن وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال گیا اور مجھے باور کروانے کی کوشش کی کہ اس نے فیصلہ میرٹ ہی پر کیا ہے۔اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ضرور ہے تو میں نے متعلقہ پٹواری کے نام پروانہ جاری کرنے کا حکم صادر کیا کہ وہ تاریخ مقررہ پر مکمل ریکارڈ کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو۔پھر ایک ناقابل یقین واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ مذکورہ مقدمات کی تاریخ پیشی سے ایک روز قبل مجھے ضلع ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف کے پی اے کا فون آیا اور محترم ناظم صاحب کا حکم سنایا گیا کہ کل میری عدالت میں دو کیسوں کے انتقالات کی اپیلوں کی سماعت ہے، مدعا علیہان ناظم صاحب کے خاص آدمی ہیں، آپ نے دو انتقالات کی اپیلیں خارج کرنی ہیں اور ناظم صاحب کو اس کی رپورٹ بھی کرنی ہے۔ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ مذکورہ انتقالات متعلقہ ریونیو افسر کو کہہ کر جناب ناظم صاحب ہی نے

مجھے ضلع ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف کے پی اے کا فون آیا کہ کل میری عدالت میں دو کیسوں کے انتقالات کی اپیلوں کی سماعت ہے، مدعا علیہان ناظم صاحب کے خاص آدمی ہیں، آپ نے دو انتقالات کی اپیلیں خارج کرنی ہیں

ناظم ضلع کے پی اے صاحب شدید غصے میں آ گئے اور گویا ہوئے، ''آپ کس ملک میں رہ کر میرٹ کی بات کر رہے ہو؟ کہاں ہے میرٹ؟''

تصدیق کروائے تھے۔ اس وقت مجھے وہاں تعینات ہوئے صرف اڑھائی ماہ کا قلیل عرصہ ہوا تھا اور میری پوری سابقہ سروس میں اس نوعیت کی یہ پہلی سفارش تھی کہ ناجائز کام کرنے کا حکم دیا جا رہا تھا اور ساتھ کام کر کے رپورٹ کرنے کا بھی کہا جا رہا تھا۔

حالانکہ نارمل حالات میں عدالتی معاملات میں سیاستدان بڑا سوچ سمجھ کر سفارش کرتے تھے لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ حالات کو اس نہج تک پہنچانے میں اپنے سرکاری افسران کا بہت بڑا ہاتھ تھا، جب افسران اپنی نوکری بچانے کے چکروں میں سیاستدانوں کے غلط اور ناجائز کام کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر اس طرح کی ڈیمانڈز کا آنا ایک فطرتی عمل تھا۔

ایک کیریئر آفیسر کے لیے اس سے زیادہ پریشانی کیا ہو سکتی تھی کہ کسی سٹیشن پر سروس شروع ہوتے ہی اس طرح کے نامساعد حالات بن جائیں۔ میں بہت پریشان ہو گیا۔ میرے لیے اب دو ہی آپشن تھے کہ یا تو میں اپنی نوکری بچا لوں اور اپنے باقی ساتھی افسران کی طرح ناظم صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر کسی کی حق تلفی کروں اور انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کا قتل کروں یا پھر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہوں اور نتائج کی پروا کیے بغیر اپنے اللہ کی خوشنودی کی خاطر انصاف کا علم بلند کروں۔ اور اپنے رب کے ہاں سرخرو ہو جاؤں۔

چنانچہ میں نے اپنی نوکری بچانے کے بجائے حق اور سچ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جو میرے منصب کا تقاضا تھا اور اس کے شایان شان بھی تھا۔ اور مجھے اپنے اللہ پر یقین کامل تھا کہ وہ میری راہنمائی فرمائے گا، میری مدد بھی کرے گا اور مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔

اگلے دن میں نے عدالت کی کارروائی شروع کی۔ زیر بحث مقدمہ کے لیے آواز دلائی گئی۔ فریقین مع اپنے اپنے وکلاء پیش عدالت ہوئے، مقدمہ پہلے ہی سے بحث میں چل رہا تھا۔ وکلاء سے پوچھا گیا کہ وہ بحث کے لیے تیار ہیں تو دونوں وکیلوں نے اثبات میں جواب دیا۔ مدعا علیہان کا وکیل بڑا پرجوش تھا کیوں کہ اس کو معلوم تھا کہ اس کی طرف سے بہت بڑی سفارش آئی ہوئی ہے اور اسے قوی یقین بھی تھا کہ فیصلہ اس کے موکلان کے حق ہی میں ہونا ہے۔ جبکہ مدعیان کا وکیل بڑا مایوس نظر آ رہا تھا شاید اس کو بھی یہ مقدمہ ہارنے کا مکمل یقین تھا۔

میں نے مدعیان کے کونسل کو بحث شروع کرنے کا کہا۔ اس نے اپنے دعوے کے حق میں دلائل دینے شروع کیے، دلائل بڑے وزنی تھے کیوں کہ وہ حق پر تھا۔ اس نے متوفی کے بچوں کا نادرا سے جاری کردہ شناختی کارڈ اور فارم 'ب' پیش کیا اور گاؤں کے کچھ لوگوں کے بیان حلفی بھی پیش کیے اور بتایا کہ محلفین عدالت میں اصالتاً موجود ہیں۔ حسب استدعا کونسل مدعیان مذکورہ محلفین کو عدالت میں بلایا گیا تا کہ ان کی بات سنی جا سکے۔ اس پر مخالف وکیل

نے اعتراض اٹھایا کہ قانون کے مطابق اپیل سننے والی عدالت شہادت قلمبند نہیں کر سکتی۔ مدعیان کے کونسل نے جواب دیا کہ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے، حقائق تک پہنچنے کے لیے اور اپنی تسلی کے لیے کسی بھی شخص کا موقف لے سکتی ہے۔ چنانچہ کونسل مدعا علیہان کے موقف کو مسترد کرتے ہوئے محلفین کی بات سنی گئی تو انہوں نے بھی تصدیق کی کہ متوفی کے تین بچے تھے وہ لاولد نہیں تھا۔

اور محکمہ مال کے افسران نے بچوں کے ساتھ زیادتی کی ہے اور ان کا وراثتی رقبہ غیر قانونی طور پر دیگر افراد کے نام منتقل کر دیا ہے۔ کونسل مدعا علیہان کو بحث کا موقع دیا گیا لیکن وہ دعوی کی تردید میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ پیش کر سکا۔ پٹواری حلقہ حسب الحکم مع ریکارڈ موجود تھا۔ اس کو بلا کر ریونیو ریکارڈ ملاحظہ کیا گیا۔ فریقین کے وکلاء کے دلائل سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ متوفی لاولد نہیں تھا اور اس کے تینوں بچوں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہوئے ان کو ان کے جائز اور قانونی حق سے محروم کیا گیا ہے۔ چنانچہ مدعیان کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے زیر مقدمہ دونوں متنازع انتقالات کو منسوخ کر دیا گیا اور متعلقہ ریونیو آفیسر کو تحریری حکم دیا گیا کہ عدالتی فیصلہ کا کاغذات مال میں حسب ضابطہ اندراج کرے۔ دیگر مقدمات کی سماعت مکمل کر کے میں اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

ابھی میں اپنے چیمبر میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھا کر دیکھا تو وہ ضلع ناظم کے دفتر کا نمبر تھا۔ کال اٹینڈ کی اور سلام کیا تو دوسری طرف ضلع ناظم موصوف کے پی اے بول رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیئے بغیر ارشاد فرمایا کہ ناظم صاحب شدید غصے میں ہیں وہ کہہ رہے ہیں، ”ان کے بندوں کے خلاف کیوں فیصلہ دیا ہے جب کہ آپ کو قبل از وقت بتا دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ کو شاید یہ نہیں پتہ کہ یہاں اگر ناظم صاحب ڈی سی او کو بھی کوئی کام کہیں تو وہ ڈی سی او ہوتے ہوئے بھی خود آ کر ناظم صاحب کو رپورٹ کرتے ہیں کہ کام ہو گیا ہے۔ آپ ایک اسسٹنٹ کمشنر (ڈی ڈی۔ او۔ آر) ہو کر بھی اتنی جرات کے مالک ہیں کہ ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ آپ کا شاید اس ضلع میں نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اب آپ کی خیر نہیں“۔ میں نے اسے بڑے تحمل سے کہا کہ ناظم صاحب کو بتائیں کہ آپ کے بندوں کا میرٹ نہیں بنتا تھا اس لیے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ میری اس بات پر ناظم ضلع کے پی اے صاحب شدید غصے میں آ گئے اور گویا ہوئے، ”آپ کس ملک میں رہ کر میرٹ کی بات کر رہے ہو؟ کہاں ہے میرٹ؟“ اب پی اے کی بات تو کافی حد تک درست بھی تھی اور کہا کہ میں ناظم صاحب کو لائن دے رہا ہوں، آپ ان سے خود بات کر لیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور ناظم صاحب کے لائن پر آنے کا

میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے تبادلہ کا پروانہ میرے ہاتھ میں تھمایا گیا اور مجھے سیکرٹری ڈسٹرکٹ ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی گوجرانوالہ تعینات کر دیا گیا تھا

اپنے تبادلہ کا پروانہ لے کر سیکرٹریٹ سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات انسان کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے کس طرح سے اسباب مہیا فرماتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان کوشش تو کرے

انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر فون کو ہولڈ رکھنے کے بعد ہیلو کی آواز آئی تو میں نے ٹھک سے سلام کیا لیکن دوسری طرف ناظم صاحب نہیں بلکہ وہی پی اے صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ناظم صاحب سخت غصے میں ہیں وہ آپ سے بات نہیں کرنا چاہتے اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس نے جب ناظم صاحب کو میرٹ والی بات بتائی تو وہ اور بھی غصے میں آگئے ہیں۔ پی اے نے ناظم صاحب کا یہ پیغام بھی دیا کہ اے سی سے پوچھو کہ ''ایہہ کیہڑا چودھری اے (یہ کون سا چودھری ہے؟) سنن وچہ آیا اے کہ ایہہ ارائیں اے تے اتھاں آ کے وت چودھری بنا ودا اے (سنا ہے کہ یہ آرائیں ہے اور یہاں آ کر چودھری بنا ہوا ہے۔) اتھاں ارائیاں نوں کائی پچھدا ناہیں'' (یہاں تو آرائیوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے)۔ میں بڑے تحمل سے ایک پیشہ ور منتظم کی طرح ساری باتیں سن رہا تھا لیکن یہ بات سن کر میں بھی تھوڑا غصے میں آگیا تو میں نے پی اے صاحب سے کہا کہ ناظم صاحب کو بتا دے کہ ''ہاں میں ارائیں آں پر میں ضلع قصور دا ارائیں آں، تے ساڈے ضلعے وچ صرف ارائیں ای چودھری نیں۔ (ہاں میں آرائیں ہوں لیکن میں ضلع قصور کا آرائیں ہوں۔ ہمارے ضلع میں صرف آرائیں ہی چودھری ہیں)۔ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد میں پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا کہ اس ملک میں میرٹ پر کام کرنا کتنا مشکل ہے بلکہ لوگوں نے اس کو ناممکن بنا دیا ہوا ہے۔ ہم کس معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں لوگ یتیموں کا مال بھی ہڑپ کر جاتے ہیں اور ان کو اپنے اس فعل پر ذرا بھی شرمندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کو خیال آتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انہوں نے بھی اس دنیا کے ناظم اعلیٰ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں پر نہ دنیا کا مال کچھ کام آئے گا اور نہ یہاں کی جاہ وحشمت۔

میں خیالات کی دنیا سے باہر نکلا تو اپنی نوکری کی فکر لاحق ہوئی کہ اتنے طاقتور ضلع ناظم کو ناراض کر کے ان کے ضلع میں کیسے گزارہ ہوگا۔ جہاں پر تمام افسران صرف اور صرف ضلع ناظم کی خوشنودی کے لیے کام کر رہے ہوں، جہاں پر ضلع ناظم صاحب نے ایک ریٹائرڈ افسر کو ایکسٹینشن دلوا کر ای ڈی او (ریونیو)/کمشنر جیسی طاقتور سیٹ پر بٹھایا ہوا ہو جس کے پاس تمام ڈی ڈی او (آر) (اسسٹنٹ کمشنرز) کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت ہونا ہو، پھر سالانہ خفیہ رپورٹس بھی انہی افسران نے لکھنی ہوں اور ایک کیریئر افسر کی ترقی بھی ان سالانہ خفیہ رپورٹس کی بنیاد پر ہونی ہو۔ تو کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ بزدلانہ لیکن دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ اس ضلع سے فوراً تبادلہ کروا لیا جائے کیوں کہ مجھے اس اسٹیشن پر آئے ہوئے پونے تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اگر تین ماہ کا عرصہ پورا ہو جاتا تو وہاں سے سالانہ خفیہ رپورٹ لکھوانا لازمی ہو جاتا اور پھر میں

وہاں کے افسران اور ضلع ناظم کے رحم وکرم پر ہوتا۔

وقت کم تھا لیکن کام بہت بڑا اور اوپر سے طرفہ تماشا یہ کہ میرے پاس سیاسی سفارش بھی کوئی نہ تھی۔

چنانچہ میں نے اپنے افسران بالا اور افسران مجاز سے بنفس نفیس ملنے کا فیصلہ کیا اور دو تین دن کی چھٹی لے کر سول سیکرٹریٹ لاہور چلا گیا۔ محترم سہیل شہزاد صاحب جو بہت شفیق اور مہربان افسر تھے۔ وہ اس وقت ایڈیشنل سیکرٹری (ایڈمن) کے عہدے پر فائز تھے۔ میں ان سے ملا اور سارے حالات بتائے، انہوں نے میری بات بڑے غور سے سنی اور مجھے تسلی بھی دی کیونکہ اس ضلع کے حالات کا ان کو بھی کافی حد تک علم تھا۔ انہوں نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اگلے دن آنے کا کہا۔ اللہ ان کا بھلا کرے کہ میں اگلے دن جب ان کے دفتر گیا تو اس وقت میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے تبادلہ کا پروانہ میرے ہاتھ میں تھمایا گیا اور مجھے سیکرٹری ڈسٹرکٹ ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی گوجرانوالہ تعینات کر دیا گیا تھا۔

میں نے جب افسر موصوف کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے۔ وہ سیکرٹریٹ میں بیٹھے ہی اپنے افسران کی فلاح و بہبود کے لیے ہیں۔ اگر وہ اپنے افسران کو تحفظ فراہم نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ میں اپنے تبادلہ کا پروانہ لے کر سیکرٹریٹ سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات انسان کی پریشانیوں کو دور کرنے کے کے لیے کس طرح سے اسباب مہیا فرماتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں تو مارے اور جب کوئی انسان خلوص نیت سے کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو اللہ عزوجل کی مدد اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ میں واپس گیا، عہدے کا چارج چھوڑا اور گوجرانوالہ آ کر نئے عہدے کا چارج لے لیا اور اپنے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے اتنی بڑی پریشانی سے نجات دلائی اور میرے سابقہ اسٹیشن پر تین ماہ مکمل ہونے سے قبل ہی میرا تبادلہ ہو گیا اور خراب سالانہ خفیہ رپورٹ کی تلوار بھی میرے سر سے ٹل گئی۔ وقت گزرتا گیا، میں اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا جہاں بھی حکومت وقت نے تعینات کیا جا کر وہاں جائن کیا اور عوام کا خادم بن کر ان کی خدمت شروع کر دی۔

یہ 2017ء کی بات ہے جب میں ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو، جنرل اور فنانس اینڈ پلاننگ) کے طور پر اپنے فرائض منصبی سر انجام دے رہا تھا (قارئین حیران ہوں گے میں بیک وقت تینوں عہدوں پر کیوں کام کر رہا تھا؟ دراصل اس وقت ضلع کے معروضی حالات کچھ ایسے تھے کہ کوئی بھی افسر وہاں پر پوسٹنگ کروانے اور کام کرنے کو تیار نہ تھا)۔ ایک دن میرے موبائل نمبر پر ایک نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ میں نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف بولنے والے شخص نے اپنا تعارف

ساجد بہت خوش تھا حالانکہ اس کو اس خوشی اور انصاف کے حصول کی خاطر دس سال تک تجل خراب ہونا پڑا

اس ٹیم نے بڑی سوچ بچار اور بحث مباحثے کے بعد اوپر دیے گئے اختیارات انتظامیہ کو دیے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اختیارات انتظامی نوعیت کے ہیں اگر یہ بھی عدلیہ کو دے دیے گئے تو ریاستی معاملات پر انتظامیہ کی گرفت کمزور ہو جائے گی

ساجد کے طور پر کروایا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ سوہاوہ سے بات کر رہا ہے۔ میں نے کہا بھائی میں تو آپ کو نہیں پہچان پا رہا، اپنا تفصیلی تعارف کرواؤ کیوں کہ مجھے وہاں سے ٹرانسفر ہوئے تقریباً دس سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔

اس نے جواب دیا کہ سر میں وہ ساجد بات کر رہا ہوں جس کے لیے آپ نے وقت کے طاقتور ترین ضلع ناظم سے ٹکر لی تھی اور ہم یتیم بچوں کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ مجھے اس کی کال سے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس سے ان کے کیس کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے مجھے مبارک باد دینے کے لیے اور شکریہ ادا کرنے کے لیے کال کی ہے کیونکہ ریونیو کی صوبہ پنجاب کی سب سے بڑی عدالت- بورڈ آف ریونیو- نے آپ کا کیا گیا فیصلہ بحال کر دیا ہے۔ آج ساجد بہت خوش تھا حالانکہ اس کو اس خوشی اور انصاف کے حصول کی خاطر دس سال تک خجل خراب ہونا پڑا۔ میں نے اس سے مزید تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا: ”مخالف فریق نے آپ کے کیے گیے فیصلوں کے خلاف ای ڈی او (ریونیو)/ کمشنر کی عدالت میں اپیل کی۔ افسر موصوف تو بیٹھے ہی ناظم صاحب کے حکم کی تعمیل کے لیے تھے انہوں نے دو تاریخوں میں آپ کے کیے گیے فیصلوں کے خلاف اپیلیں منظور کر لیں اور ناظم صاحب کی نظروں میں سرخرو ہو گئے“۔ ساجد اس دن بہت خوش تھا اور مجھ سے مل کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میری پوسٹنگ اس کے گھر سے بہت دور تھی۔ میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا کیونکہ مجھے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان اچھی طرح یاد ہے کہ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والا شخص بہت بڑے اجر کا مستحق ہے۔

جب جنرل پرویز مشرف نے ناظمین والا لوکل گورنمنٹ سسٹم نافذ کرنے کے لیے اور نام نہاد اصلاحات کے لیے ایک ادارہ (نیشنل ری کنسٹرکشن بیورو) تشکیل دیا جس کی سربراہی جنرل (ریٹائرڈ) تنویر نقوی کو دی گئی جنہوں نے سول اداروں میں اصلاحات کرنا تھی۔ بعد میں اس ادارے کی سربراہی جناب دانیال عزیز کو سونپی گئی جو اس وقت جنرل پرویز مشرف کے قریبی ساتھی تھے۔ وہ آج کل مسلم لیگ (ن) کے ایم این اے ہیں اور اس سیاسی جماعت کے انتہائی قریبی حلقوں میں شامل ہیں۔ اس بیورو کے دیے گئے نظام کے تحت بیورو کریسی جو کسی بھی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے، اسے توڑنے کے لئے ڈپٹی کمشنر کے اختیارات کی بندر بانٹ کی گئی۔ کچھ اختیارات ضلع ناظم کو، کچھ پولیس اور بہت سارے اختیارات عدلیہ کو دے دیے گئے جبکہ آئین پاکستان کی روح کے مطابق 1996ء میں جب عدلیہ اور انتظامیہ کو علیحدہ کیا گیا تھا تو اس وقت بھی آئینی ماہرین نے بڑے سوچ بچار اور سیر حاصل بحث و تمحیص کے بعد مجموعہ

Scanned with CamScanner

تعزیرات پاکستان کے باب نمبران 8,9,10 اور 13 اور مجموعہ ضابطہ فوجداری میں موجود تمام جرائم کے مقدمات سننے کے اختیارات انتظامی مجسٹریٹس کو دے دیے تھے۔ کیونکہ یہ اختیارات انتظامی نوعیت ہی کے تھے۔

جب ہماری سلیکشن بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئی تو حکومت پنجاب نے ہمیں ابتدائی تربیت کے لیے پراونشل سروسز اکیڈمی پشاور بھیج دیا۔ وہاں پر جناب سلیم خاں جو اس وقت ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر فائز تھے اور بعد میں سیکرٹری قانون حکومت شمال مغربی سرحدی صوبہ اور جج پشاور ہائیکورٹ بھی رہے ہمیں مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898 پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن دوران کلاس انہوں نے بتایا کہ جب 1996ء میں عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کیا جا رہا تھا وہ اس آئینی اور قانونی ٹیم کا حصہ تھے جو اس مقصد کے لئے تشکیل دی گئی تھی۔ تو اس ٹیم نے بڑی سوچ بچار اور بحث مباحثے کے بعد اوپر دیے گئے اختیارات انتظامیہ کو دیے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اختیارات انتظامی نوعیت کے ہیں اگر یہ بھی عدلیہ کو دے دیے گئے تو ریاستی معاملات پر انتظامیہ کی گرفت کمزور ہو جائے گی، امن عامہ کی صورتحال بگڑ جائے گی اور ملک میں بدامنی پھیل جائے گی تو پھر حالات کو قابو کرنا کسی کے بس میں نہیں رہے گا۔ ان کی یہ بات آنے والے دنوں میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی اور صوبائی حکومتیں اتنی پریشان ہوئیں کہ ماسوائے صوبہ پنجاب کے باقی تمام صوبوں نے مذکورہ بالا اختیارات کسی نہ کسی صورت میں انتظامیہ کو واپس کر دیئے اور حکومت کی رٹ کو مضبوط کرلیا۔

لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مجریہ 2001ء کے نفاذ کے نتیجہ میں ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی شکل ہی بگاڑ دی گئی، اس تبدیلی کو اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کا نام دیا گیا جب کہ یہ اختیارات کی بندر بانٹ کا دوسرا نام تھا۔ یہ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مورخہ 14 اگست 2001ء سے نافذ العمل ہوا۔ لیکن 13 اگست 2001ء تک کے مسودے میں ایک محکمہ ای ڈی او (مجسٹریسی) کا بھی اس میں موجود تھا۔ جسے راتوں رات مذکورہ آرڈیننس سے نکال دیا گیا۔ اس محکمہ کو اس طرح آرڈیننس سے نکالنا ایک بہت بڑی بدنیتی تھی۔ اس سارے عمل کے پیچھے کیا محرکات تھے، ابھی تک یہ معمہ ہے۔

میری رائے کے مطابق یہ سارا عمل بین الاقوامی ایجنڈے کی تکمیل کے لئے کیا گیا۔ کیونکہ بہت سے بین الاقوامی اداروں نے نیا سسٹم لانے کے لیے فنڈنگ بھی کی تھی۔ ان غیر ملکی اداروں کے مقاصد اور اہداف صرف اور صرف پاکستان کے اداروں کو تباہ کرنا اور ان کو اتنا کمزور کر دینا کہ تھا کسی ایمرجنسی کی صورت میں ملک میں اس قدر افراتفری پھیلے کہ ملک کو سنبھالے کے لیے کوئی مرکزی اور طاقتور ادارہ

یہ گھناؤنا فعل ابھی تک جاری وساری ہے کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ ایک طاقتور انتظامیہ کے ہوتے ہوئے کسی بھی ملک کو زیر کرنا ایک خواب کے علاوہ کچھ بھی نہیں

ہم نومنتخب یونین ناظمین کے لیے دفاتر ڈھونڈ رہے تھے، وہ اس دن بڑے خوشگوار موڈ میں تھے، کہنے لگے،''چودھری صاحب مجھے تو یہ کام کرتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسا کہ ہم اپنی قبریں خود ہی کھود رہے ہیں''

موجود نہ ہو، اور یہ گھناؤنا فعل ابھی تک جاری و ساری ہے کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ ایک طاقتور انتظامیہ کے ہوتے ہوئے کسی بھی ملک کو زیر کرنا ایک خواب کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

خیر، بات ہو رہی تھی جنرل مشرف کے نافذ کردہ ''لوکل گورنمنٹ سسٹم'' کی۔ میں ان دنوں میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں بطور مجسٹریٹ/ زونل سیکرٹری تعینات تھا۔ پی ایم ایس (پی سی ایس) مایہ ناز افسر جناب نسیم صادق اسسٹنٹ کمشنر لاہور کینٹ تھے۔ ایک دن میں ان کے ساتھ ڈیوٹی پر تھا۔ ہم نومنتخب یونین ناظمین کے لیے دفاتر ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اس دن بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ کہنے لگے،''چودھری صاحب مجھے تو یہ کام کرتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسا کہ ہم اپنی قبریں خود ہی کھود رہے ہیں''۔ ضلع ناظم لاہور کے لیے میاں عامر محمود اور حافظ سلمان بٹ کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ لیکن میاں عامر محمود کامیاب ٹھہرے۔ یہ الیکشن عدلیہ کی نگرانی میں ہوئے تھے۔ میری ڈیوٹی گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول باغبانپورہ لاہور میں انتظامی امور دیکھنے کے لیے لگی تھی۔ وہاں پر جو کچھ ہوا میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ موصوف کو کس طرح ضلع ناظم بنایا گیا اور انہیں یہ عہدہ دلانے میں کیا کیا پاپڑ بیلے گئے اور کون کون سی طاقتوں نے تن من دھن کی بازی لگائی یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جس کو پھر کبھی بیان کریں گے۔

نیا نظام نافذ ہونیوالا تھا۔ نومنتخب ضلع ناظم لاہور میاں عامر محمود صاحب کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا گیا۔ اس کھانے میں حکومت وقت کے چہیتے سیاستدانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں لاہور کے تمام مجسٹریٹس، اسسٹنٹ کمشنرز۔ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر لاہور کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ اعلیٰ فوجی قیادت اور فوجی مانیٹرنگ ٹیموں کے افسران کو بھی بلایا گیا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ کھانا شروع ہونے سے پہلے تمام انتظامی افسران کو حکم ملا کہ وہ اپنی اپنی گاڑیوں سے نیلی بتیاں اتار دیں۔ چنانچہ حکم پر فوری اور من وعن عمل ہوا اور میرے سمیت بہت سارے افسران بغیر کھانا کھائے گھروں کو لوٹ گئے۔ انتظامی افسران، جو اپنے آپ کو ریاست کی کریم سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ امور ریاست ان کے بغیر نہیں چلائے جا سکتے۔ ان کو کھانے پر بلا کر ان کی جس طرح باجماعت توہین کی گئی وہ اپنی مثال آپ ہے اور اس توہین سے بھی ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ اور ہماری گردن کا سریہ پھر بھی نہ نکلا۔ نیا نظام نافذ ہونے کے بعد میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں تعینات سارے افسر نئی تعیناتی کے انتظار میں تھے۔ اس وقت جناب عرفان علی صاحب جو ایک ڈی ایم جی افسر تھے، میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں بطور چیف کارپوریشن آفیسر تعینات تھے، مذکورہ افسر اپنی دیانتداری، محنت، جانفشانی، دلیری اور صاف گوئی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔

ایک دن ہم میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں تعینات تمام انتظامی افسران ان کے آفس میں موجود تھے۔ نئے نظام کی بات چل نکلی۔ میں نے سوال کیا: ”سر انتظامیہ موجودہ حالات تک کیسے پہنچی۔ ان حالات کے پیچھے کیا کہانی ہے؟“ انہوں نے بڑا خوبصورت جواب دیا، فرمانے لگے، ”جو قومیں اپنے ماضی سے سبق نہیں سیکھتیں ان کا مستقبل ہمیشہ تاریک ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں وہ ایک دن میں نہیں ہوا۔ اس کو تقریباً پچاس سال کا طویل عرصہ لگا ہے۔ ہماری سروس کا طرہ امتیاز عوامی خدمت تھا اور ہونا بھی چاہئے تھا لیکن ہمیں حکمرانی کی لت پڑ گئی۔ کچھ بیوروکریٹ ہمارے ملک کے وزیراعظم بھی بنے اور باقی محلاتی سازشوں میں مصروف ہوکر اقتدار حاصل کرنے کے چکروں میں پڑ گئے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم وزیراعظم تھے تو انہوں نے بھی سی ایس پی کلاس پر کاری ضرب لگائی لیکن ہمیں اس وقت بھی سمجھ نہ آئی اور ہم نے اپنا قبلہ درست نہ کیا اور اپنی روش کو برقرار رکھا۔ آج ہمیں فالتو سمجھ کر بے اختیار کر دیا گیا ہے“۔ انہوں نے مزید کہا، ”ہم نے بطور کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنر عوام کی کیا خدمت کی ہے؟ ہم نے عوام سے محبت نہیں نفرت کی ہے۔ ہم نے انہیں اپنا غلام سمجھ لیا تو اس کے جواب میں ہمیں عوامی نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔

ہمیں عدالتی اختیارات انصاف دینے کے لیے دیئے گئے تھے لیکن ہم نے کما حقہ انصاف کے تقاضے پورے نہ کیے۔ ذاتی خواہشات کی تکمیل، جاہ وحشمت کا اور ناجائز ذرائع سے دولت کا حصول ہمارا اولین مقصد زندگی بن گیا۔ ہماری پولیس، پولیس مقابلوں میں ماورائے عدالت قتل کرتی رہی اور ہمارے ڈپٹی کمشنرز ماسوائے چند استثنائی صورتوں کے پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جوڈیشل انکوائری کے لیے اس کی مرضی کا مجسٹریٹ مقرر کرتے رہے اور ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کو ”ہتھ ہولا“ رکھنے کا بھی کہتے رہے۔ اس طرح پولیس روز بروز مضبوط ہوتی گئی اور ہم کمزور۔ یہی حال عدلیہ کا رہا۔ ہم نے کبھی اسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔ وہ کسی حد تک انصاف کرتے رہے اور ہم سیاست دانوں اور پولیس کو خوش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ہم الیکشن میں حکمرانوں کی مدد کرتے رہے اور حکومتی مخالفین کو ناجائز طور پر پابند سلاسل کرتے رہے۔ ہم ”ایم پی او“ کے تحت دیئے گئے اختیارات کا غلط استعمال بھی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا الیکشن کروانے کا اختیار ہم سے لے کر عدلیہ کو دے دیا گیا۔ آج ہمیں جب بے دست و پا کیا گیا تو ہمارے حق میں ایک بھی آواز نہ اٹھی بلکہ عوام الناس نے خوشی کا اظہار کیا ہے“۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مجریہ 2001ء کے نفاذ کے بعد انتظامیہ کو اتنا مفلوج کیا گیا اور ان انتظامی افسران سے اتنا برا سلوک کیا گیا کہ جو ناقابل بیان ہے۔ کمشنر کا عہدہ

میں نے اپنے ملازمین سے کہا کہ ان ناجائز قابضین کا سامان اٹھا کر باہر پھینکو اور تحصیلدار صاحب کی عدالت کا سامان اندر رکھو اور نیا تالا لا کر لگا دو، ریونیو ملازمین نے حکم کی فوراً تعمیل کی

میرے اندر کا انسان بولا، تم تحصیل کلکٹر ہو
تمہارے فرائض منصبی ہی یہ ہیں کہ تم اپنی تحصیل
میں موجود سرکاری املاک کا تحفظ کرو

ختم کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کو ڈی سی او (کچھ لوگ اس کو ڈی سی زیرو بھی کہتے تھے) بنا دیا گیا، یہ خصوصی حکم جاری کیا گیا کہ ضلعی ناظمین ڈپٹی کمشنر والے دفاتر میں بیٹھیں گے۔ ڈپٹی کمشنر کے دفاتر کے ساتھ بنی ہوئی عدالتوں کو توڑا دیا گیا۔ بہت ساری تحصیلوں میں تحصیل ناظمین نے اسسٹنٹ کمشنرز کے دفاتر اور عدالتوں پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ بعد میں ان کو حکم دیا گیا کہ وہ لوکل گورنمنٹ کے دفاتر استعمال کریں گے۔ عدلیہ نے بھی اپنے پر پرزے نکالے اور ریونیو افسران کی عدالتوں پر قبضے کر لیے۔ انتظامی افسران کے لیے وہ بہت مشکل وقت تھا۔ بہت سے افسران نے نئے سسٹم میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور بہت سے لمبی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے یا ملک سے باہر چلے گئے۔ جو باقی بچے ان کے حوصلے بڑے پست تھے لیکن وہ جیسے تیسے سسٹم کے ساتھ چلتے رہے۔ بعض افسران نے تو اتنی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ وہ ناظمین کے تمام ناجائز احکامات خود بھی مانتے رہے اور اپنے ماتحتوں کو بھی ان کی ہر بات ماننے کا حکم دیتے رہے۔ وہ اپنی سیٹیں بچاتے رہے اور باضمیر ماتحت افسران کی سالانہ خفیہ رپورٹیں خراب کر کے ان کا کیریئر بھی خراب کرتے رہے۔ تاہم بہت سارے افسران نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور نہ تو اپنی عزت نفس مجروح ہونے دی نہ ہی اپنے ماتحتوں کی۔ ان کو ناپسندیدہ شخصیات قرار دے کر ضلع بدر کیا گیا لیکن انہوں نے صبر و استقامت، ایمانداری، عزم و ہمت اور جرات و بہادری کا دامن نہ چھوڑا اور اپنے اللہ کے ہاں سرخرو ہوئے۔

میری تحصیل سوہاوہ میں بطور اسسٹنٹ کمشنر/ڈی ڈی او۔ آر تعیناتی کے دوران بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ واقعہ سنانے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ میں آپ کو اپنی بہادری کے قصے سنا کر متاثر کروں۔ میرا مقصد صرف یہ سمجھانا ہے کہ انسان کو مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہمت، حوصلہ اور صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر آپ ہمت ہار گئے تو لوگ بڑی مچھلیاں بن کر آپ کو چھوٹی سی مچھلی سمجھ کر نگل جائیں گے۔ دوسرا یہ ہے کہ آپ کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کریں اور نہ کسی دوسرے شخص کو اپنے اختیارات میں تجاوز کرنے کی اجازت دیں۔

ہوا یوں کہ مجھے ایک دن میرے ڈی سی او صاحب کی کال آئی اور بتایا کہ انہیں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب نے فون کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سوہاوہ میں ایک نئے سول جج صاحب تعینات ہوئے ہیں۔ انہیں دفتر و عدالت کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے دفتر و عدالت کا کوئی بندوبست کر دیں۔ میں نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا۔ اگلے دن میں اپنے دفتر میں کار سرکار میں مصروف تھا کہ میرے نائب قاصد نے آکر بتایا کہ سول جج (سینئر) صاحب کا اردلی آیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ سول جج

Scanned with CamScanner

صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میرے پاس کچھ سائلین بیٹھے تھے۔ میں انہیں فارغ کر کے جج صاحب کے پاس چلا گیا۔ میں ان کا نام جان بوجھ کر نہیں لکھ رہا کہ کہیں مجھے توہین عدالت کے جرم میں نہ دھر لیا جائے۔ ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ بڑے پرتپاک طریقے سے ملے اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب کا وہی پیغام دیا جو مجھے ڈی سی او صاحب نے دیا تھا۔ میں نے ان سے کچھ وقت مانگا اور واپس آ گیا۔ دفتر واپس آ کر میں نے متعلقہ ڈی ڈی او (بلڈنگز) کو بلایا۔ انہیں مسئلہ بتایا تو انہوں نے کہا کہ ان کے محکمہ کا ایک ریسٹ ہاؤس خالی پڑا ہے۔ اس کی مرمت کر کے اس میں عدالت کا کٹہرا اور دفتر/ چیمبر بنا کر چند دنوں میں جج صاحب کو وہاں شفٹ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے اگلے دن آنے کا کہا۔ وہ حسب وعدہ اگلے دن میرے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں جج صاحب کے پاس چلے گئے۔ جج صاحب کو ساتھ لے کر مذکورہ ریسٹ ہاؤس جو تحصیل کچہری کے پاس ہی تھا چلے گئے اور جج صاحب کو موقع ملاحظہ کروایا اور تجویز دی کہ نئی عدالت وہاں بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن انہیں میری بات کچھ پسند نہ آئی۔ کہنے لگے کہ بہتر ہے کہ تحصیل آفس میں اگر کوئی عدالت خالی ہو تو اس میں نئے جج صاحب کو شفٹ کر دیا جائے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں چیک کر کے انہیں بتاؤں گا۔

میں جج صاحب سے فارغ ہو کر سیدھا تحصیل آفس گیا۔ موقع ملاحظہ کیا تو معلوم ہوا کہ تحصیل آفس میں ریونیو افیسرز کی تین عدالتیں تھیں جن میں سے دو عدالتیں جو نائب تحصیلداران کے لئے بنائی گئی تھیں اور ان کے زیر استعمال تھیں لیکن ان پر سول جج صاحبان پہلے ہی ناجائز طور پر قابض تھے۔ اب ایک عدالت باقی تھی جو تحصیلدار سوہاوہ کے زیر استعمال ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پہلے بھی مذکورہ دو عدالتوں پر سول جج صاحبان نے بغیر اجازت زبردستی قبضہ کیا ہوا ہے اور بڑی کوششوں کے باوجود عدالتیں خالی نہیں کی گئیں۔ میں وہاں سے سیدھا جج صاحب کے پاس گیا۔ ان کو بتایا کہ تحصیل آفس میں سے دو عدالتیں پہلے سے ہی عدلیہ کے پاس ہیں اور اب وہاں صرف ایک عدالت ہے جو تحصیلدار صاحب کے زیر استعمال ہے۔ وہ عدالت آپ کو نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ تحصیلدار صاحب تحصیل آفس کے انچارج ہوتے ہیں۔ میں ایک آفس کے انچارج کو ان کے دفتر سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ میں نے پھر ریسٹ ہاؤس والی آپشن دہرائی لیکن جج صاحب خاموش ہو گئے۔ شاید وہ اب وقت کی بے اختیار اور کمزور ترین انتظامیہ سے تحصیل آفس کا آخری دفتر و عدالت بھی چھین لینا اپنا جائز اور قانونی حق سمجھتے تھے۔ کیوں کہ وہ میری وہاں پوسٹنگ سے پہلے بھی اپنا یہ غیر قانونی حق استعمال کر کے دو عدد عدالتوں پر قبضہ کر چکے تھے اور ان کے اس غیر قانونی اقدام پر افسران بالا نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی

بہت ساری تحصیلوں میں تحصیل ناظمین نے

اسسٹنٹ کمشنرز کے دفاتر اور

عدالتوں پر قبضہ کرلیا

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب بہت ہی طاقتور آدمی تھے اور ہمارے ڈی سی او صاحب (ڈی سی زیرو) اتنے ہی کمزور واقع ہوئے تھے اور حالات سے سمجھوتہ کر چکے تھے

ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وقت کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب بہت ہی طاقتور آدمی تھے۔اور ہمارے ڈی سی او صاحب (ڈی سی زیرو) اتنے ہی کمزور واقع ہوئے تھے اور حالات سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔

اگلے روز دن کے تقریباً دو بجے میں فیلڈ ڈیوٹی سے واپس آ کر اپنے دفتر میں بیٹھا ہی تھا کہ اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ کرسیاں میز وغیرہ اٹھا کر تحصیل آفس کی طرف جا رہے تھے۔میں نے گھنٹی بجائی۔نائب قاصد اندر آیا۔اس سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور فرنیچر اٹھا کر کہاں لے کر جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ وہ پتہ کر کے بتاتا ہے۔تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور ایک ناقابل یقین خبر دی کہ جج صاحبان جو کہ تحصیل سوہاوہ میں منصفی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں نے تحصیل دار صاحب کے دفتر کا تالا توڑ کر ان کے دفتر کا سامان باہر پھینک کر دفتر پر قبضہ کر لیا ہے اور اب ان کے ملازمین ناجائز طور پر قبضہ کئے گئے دفتر میں اپنا فرنیچر رکھ رہے ہیں۔ملک کے منصفین کی اس حرکت کو جان کر مجھے حقیقت میں بہت دکھ ہوا۔میں سوچ میں پڑ گیا کہ جن لوگوں نے مظلوموں کی مدد کرنا تھی۔ظالموں سے قبضے چھڑوا کر مظلوموں کے حوالے کرنے تھے وہ خود ہی قبضہ گروپ بن گیے ہیں اور انصاف فراہم کرنے کی بجائے انصاف کا قتل عام کر رہے ہیں۔

میں نے دل میں سوچا کہ اگرچہ ہمارے بہت برے دن آئے ہوئے ہیں لیکن اتنے بھی برے نہیں کہ لوگ دن دیہاڑے ہمارے دفاتر پر قبضے کرنا شروع کر دیں۔پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ جب پہلی دفعہ تحصیل آفس کی دو عدالتوں پر قبضہ ہوا تھا تو اگر اس وقت کوئی مرد قلندر تھوڑی سی ہمت دکھاتا یا احتجاج کرتا اور شور مچاتا تو آج یہ تیسری اور آخری عدالت پر ناجائز قبضے کی کبھی نوبت نہ آتی۔لیکن پھر مجھے اچانک یہ خیال بھی آیا کہ کسی سرکاری افسر کو کیا پڑی کہ ایک سرکاری دفتر کے لیے کسی سے جھگڑا کرے۔ اپنے تعلقات خراب کرے۔جج صاحبان کے عمل کے خلاف کوئی کام کر کے توہین عدالت کا مرتکب ہو۔تحصیلدار کا دفتر ہی ہے نا۔تحصیلدار جانے اور اس کا کام جانے۔کون سا اس کی اپنی ذاتی جائیداد پر ناجائز قبضہ ہوا ہے؟ ہاں اگر کوئی کسی بیوروکریٹ کی ذاتی یا اس کے خاندان کے کسی فرد کی اور یا اس کے کسی جاننے والے شخص کی جائیداد کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر تو دیکھے گا تو اس کو ایسا سبق سکھایا جائے گا کہ ایسا کرنے والے کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔لیکن میرے اندر کا انسان بولا۔تم تحصیل کلکٹر ہو۔تمہارے فرائض منصبی ہی یہ ہیں کہ تم اپنی تحصیل میں موجود سرکاری املاک کا تحفظ کرو۔اگر تم اپنا یہ فرض کما حقہ ادا نہیں کر سکتے اور اپنے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ اختیارات کا استعمال انصاف کے اصولوں کے مطابق نہیں ادا کر

Scanned with CamScanner

سکتے تو تمہیں اس منصب پر فائز رہنے کا کوئی حق نہیں۔ بالآخر میں نے اپنے اندر کے انسان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نتائج کی پروا کیے بغیر جرات مندانہ اور میرٹ پر مبنی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے دفتر سے باہر نکلا۔ دو تین نائب قاصدوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ موقعہ پر موجود عدالتی اہلکاران جو تحصیلدار صاحب کی عدالت میں سامان رکھ رہے تھے سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کس کے حکم پر ناجائز قبضہ کر رہے ہیں؟ انہوں نے اسی جج صاحب کا نام بتایا جن کو میں ایک دن قبل بتا کر آیا تھا کہ تحصیلدار صاحب کی عدالت ان کو نہیں دی جا سکتی۔ میں کرب اور غصہ کی ملی جلی کیفیت میں تھا۔ عدلیہ کے عملہ کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر اپنا سامان باہر نکالیں اور عدالت خالی کر دیں۔

انہوں نے کہا، ''ہم تو اپنے جج صاحب کا حکم مانیں گے۔ آپ کا حکم ماننے کے روادار نہیں ہیں''۔ میں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اپنے جج صاحب کو جا کر میرا بتاؤ کہ میں موقع پر موجود ہوں وہ بھی تشریف لے آئیں۔ عدالتی اہلکاران اپنا سامان وہیں چھوڑ کر جج صاحب کو بلانے چلے گئے۔ میں نے اپنے ملازمین سے کہا کہ ان ناجائز قابضین کا سامان اٹھا کر باہر پھینکو اور تحصیلدار صاحب کی عدالت کا سامان اندر رکھوا اور نیا تالا لا کر لگا دو۔ ریونیو ملازمین نے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ لیکن جج صاحب نے موقع پر نہ آنا تھا اور نہ ہی آئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جج صاحب میرے اس ردعمل کی خبر ملنے پر جہلم روانہ ہو گئے تھے۔

میں اپنے دفتر واپس جا کر بیٹھ گیا اور وقوعہ کی ایف آئی آر پولیس تھانہ میں درج کروانے کے لیے استغاثہ لکھنا شروع کیا ہی تھا کہ ڈی سی او صاحب کا فون آ گیا۔ میں نے فون اٹینڈ کر کے ان کو سلام کیا۔ وہ اپنی آواز سے کافی پریشان اور گھبرائے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھ سے وقوعہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے جھٹ پوری تفصیل بتائی اور توقع کر رہا تھا کہ وہ خوش ہو کر شاباش دیں گیا ور ساتھ ساتھ میری حوصلہ بھی افزائی کریں گے۔ لیکن وہ میری تمام تر توقعات کے خلاف فرمانے لگے، ''آپ نے بہت خطرناک کام کیا ہے، سیشن جج صاحب بہت غصے میں ہیں، انہوں نے ضلع ناظم سے بھی بات کی ہے وہ بھی آپ سے بہت ناراض ہیں۔ آپ کو اس طرح عدلیہ کا سامان باہر نہیں پھینکنا چاہئے تھا۔ آپ پہلے میرے ساتھ بات کرتے''۔ میں نے عرض کی ''سر، کیا میں نے ایک ناجائز قبضہ چھڑوا کر کوئی غلط کام کیا ہے؟ سر، کیا منصفین کے پاس اس طرح قبضہ کرنے کا کوئی اخلاقی یا قانونی جواز ہے؟ کیا اعلی عدلیہ نے ان جج صاحبان کو اس طرح کا کام کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے؟ نہیں سر، وہ ایسا کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ جو کچھ ہوا یہ جج صاحب کا ذاتی فعل تو ہو سکتا ہے عدلیہ کا نہیں۔ سر، کل کو کوئی اور سول جج صاحب آئیں گے تو وہ میرے دفتر پر قبضہ کر لیں گے، پھر کوئی سینئر سول جج صاحب آئیں گے انہیں آپ کا دفتر اچھا لگے گا وہ اس پر قبضہ کر لیں گے۔ تو پھر کیا ہو گا۔ یہ سلسلہ کہیں پر تو رکنا چاہیے تھا اور میں نے اس سلسلہ کو روکنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے''۔

ڈی سی او صاحب کو میری یہ باتیں سن کر کچھ ہمت ہوئی اور تھوڑے سے نرم ہوئے اور مجھے پوچھنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا، ''سر آپ اس واقعہ کی ایک رپورٹ جناب رجسٹرار لاہور ہائی

عبدالستار اعوان اور سابق ڈپٹی کمشنر جناب عبدالغفور چودھری

کورٹ، لاہور کو بھیج دیں۔ ان لوگوں کے خلاف ضرور قانونی کارروائی ہو گی۔ کیونکہ اعلیٰ عدلیہ کبھی اس طرح کے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کی نہ تو اجازت دے گی اور نہ ہی حوصلہ افزائی کرے گی''۔

لیکن جناب ڈی سی صاحب ایسا کرنے کو تیار نہ تھے۔ تب میں نے کہا،'' سر، اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو میں اس وقوعہ کی رپورٹ اپنے دستخطوں سے آپ کو بھیجتا ہوں اور اس کی ایک کاپی جناب رجسٹرار لاہور ہائیکورٹ، لاہور کو برائے اطلاع بھیج دیتا ہوں تاکہ یہ معاملہ اعلیٰ عدلیہ کے نوٹس میں آ جائے اور عدلیہ کا نام بدنام کرنے والوں کے خلاف حسب ضابطہ کارروائی عمل میں لائی جا سکے۔ جس سے مستقبل میں اس طرح کے واقعات کو روکا جا سکے گا''۔ جناب ڈی سی او صاحب چارو ناچار اس بات پر راضی ہو گئے۔ لیکن مجھے اس واقعہ کی ایف آئی آر دینے سے منع کر دیا۔ بعد میں مجھے نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس واقعہ سے متعلق مکمل طور پر خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد میری ضلعی ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف (موجودہ وفاقی وزیر فواد چودھری کے چچا) کے ساتھ بھی ایک بالکل ناجائز کام نہ کرنے کی وجہ سے ان بن ہو گئی جس کی تفصیل میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ان حالات میں میرے لئے اس ضلع کی زمین تنگ کر دی گئی اور میں نے وہاں سے اپنا تبادلہ کروا لیا اور خاموشی سے اپنے عہدے کا چارج چھوڑ کر نئی تعیناتی والی جگہ پر نئے جذبے کے ساتھ اپنے فرائض منصبی سر انجام دینے شروع کر دیئے۔ اس عدالت کا بعد میں کیا ہوا میرے علم میں نہیں ہے۔ بس یہ تھی میری زندگی کی چند اہم یادداشتیں جنہیں میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں مَیں ''قومی ڈائجسٹ'' کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

MONTHLY **QAUMI DIGEST** LAHORE CPL NO 175

Scanned with CamScanner